

حسب طرہ نمبر ۱۱۰۴



قواعد رسالہ "نگار"

- ۱۔ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شائع ہوتا ہے۔
- ۲۔ رسالہ نہ پونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہئے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا۔
- ۳۔ خط کتابت کی صورت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے۔ سپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔
- ۴۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
- ۵۔ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئیں۔
- ۶۔ سالانہ قیمت پانچ روپیہ، ششماہی تین روپیہ۔ بیرون ہندسات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے۔

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ	ترخنامہ اجرت اشتہارات	تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ	(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے ان کو بیس فیصد کمیشن دیا جائیگا	بارہ مرتبہ	۱۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ	میجاوا اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے۔	ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

نگار ایک مشہور علمی و ادبی مجلہ

۸	پیاری دنیا	رتن ناتھ سرشار	۸	مضامین عالمگیر	۸	علم الکلام	۸	مولانا شبلی	۸	مولانا تاج محمد
۸	کایا پلٹ	سیر کسار	۸	آغاز اسلام	۸	کلام	۸	سیرۃ النبی جلد اول	۹	نبات العرش
۶	میٹھی چھری	خدائی فوجدار	۸	کلیات فارسی	۸	رسائل شبلی	۸	دوم	۱۰	مرآة العروس
۸	طرحدار لونڈی	حاجم سرشار	۸	کلام شبلی اردو	۸	مقالات شبلی	۸	سوم	۱۲	توبۃ النصوح
۸	طلسمی فانوس	الف لیلہ طرز ناول	۸	امیر مینائی	۸	شعر العجم جلد اول	۸	الفاروق	۸	موعظ حسنہ
۸	جوالا پرشاد برقی	کاستی	۸	صنم خانہ عشق	۸	دوم	۸	سیرۃ النعمان	۸	رویائے صادقہ
۱۲	مرزا لکھی	حوالہ مخدع عیار	۸	مرآة الغیب	۸	سوم	۸	الغزالی	۸	ایامی
۱۲	مار آستین	قشعی سجاد حسین	۸	محامد خاتم النبیین	۸	چہارم	۸	المامون	۸	فسانہ مبتلا
۱۲	ہنگامی دلہن	احسن الذی	۸	ضیائے سخن	۸	بیختم	۸	سوانح مولانا روم	۸	ابن الوقت
۱۲	ممشوہ فرنگ	حاجی بغلول	۸	مکاتیب امیر مینائی	۸	موازنہ انیس دیر	۸	سفرنامہ معروضام	۱۲	مصائب غدر

دنگار

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۹ء

۷۵	باب الاستفسار	۲	ملاحظات
۸۲	مطبوعات موصولہ	۹	حکومت برطانیہ کی وسعت کاراز۔ عبد القیوم ریا
۸۸	ہباریہ (م۔ ہبار)	۲۰	بازگشت (مجنون گورکھپوری)
۸۹	صبح۔ راوی کے کنارے (راشد علیپوری)	۳۹	تصوف اسلام پر ایک زخاندہ نظر (عبدالملک روی)
۹۰	مقبورہ ہمایون (محمودہ اسرائیلی)	۴۹	وعدہ شکن (مشرعادی)
۹۲	آزادی (جگر بریلوی)	۵۶	فسانہ عجائب (نقاد)
۹۳	غزلیات	۶۵	ریختی گوئی کا موجد کون تھا؟ (سید تمکین لکھنوی)
۹۵	معلومات	۷۲	باب المراسلہ والمناظرہ

نگار

اڈیسر۔ نیاز فتحپوری

جلد (۱۶) اگست ۱۹۲۹ء شمار (۲)

ملاحظات

اگر خالص لکھنوی آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو غالباً اس کے صرف تین عنصر دریافت ہوں گے۔ شاعر، حکیم، انیونی اور ان تینوں کو اپنی فطرت، پیشہ اور مشرب کے لحاظ سے جس درجہ درجیاں مرتب، صلح کل اور منکسر مزاج ہونا چاہئے ظاہر ہے۔ یہ میں اس وقت کہتا ہوں ورنہ اس سے قبل ادانل عمر اور زمانہ طالب علمی میں، جس لکھنؤ کو میں نے دیکھا وہ موجودہ لکھنؤ سے مختلف تھا۔ مولوی صدیق حسن غازی پوری میرے اتالیق ہر وقت میرے ساتھ رہتے تھے اور ہر چند یہ اپنے حلقہ احباب میں بہت رنگین مزاج مشہور تھے، مگر میرے لئے وہ ایک مستقل بے آب و رنگ چیز تھے اور میں نے ہمیشہ انکو نگاہ کراہت سے دیکھا۔ دن کا تمام حصہ اور رات کے کچھ گھنٹے انہیں کی بے ہری اور عبوس فطرت کی معیت میں بسر ہوتے تھے اور میری حالت ایک طائر پر بند سے زیادہ نہ تھی۔ اس لئے اگر کسی دن مجھ کو آزادی نصیب ہو جاتی تھی، تو میں لکھنؤ کو حدود و حریص نگاہوں سے دیکھتا تھا اور اس قلیل فرصت کو تاج و مطالعہ نہیں بلکہ زیادہ تر صرف قیاس و خیال سے کام لیکر رنگین بنانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی مجھے وہ نامعلوم سی کشش یاد ہے جو بہاں کی درد دیوار میں محسوس کرتا تھا اور ہنوز اس مجرت کی لذت میرے دل سے جو نہیں ہونی، جو بہاں کی فضا سے پیدا ہو گئی تھی۔ اس کو میری

لکھنوی زندگی کا دور اولین سمجھنا چاہئے

میری عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ سال کی ہو گئی، لیکن نہ صرف صحت جسمانی و استواری اعضاء کے لحاظ سے بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ فارسی ادبیات ختم کر چکا تھا اور عربی کے درس نظامی کی نشاط کش اور ہادیم لذات مشغلہ کے باوجود ابھی تک غرق و نظیری، غالب و بیدل میرے دل و دماغ پر مستولی تھے۔ صوری و معنوی دونوں طرح دوسروں کو بھی نوجوان نظر آتا تھا اور خود بھی عنفوان شباب کی لذت کو ایک نئی کھلنے والی کلی کی خوشبو کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ میرے والد اس وقت دولت گنج کے تھانہ میں انچارج تھے اور چونکہ خود فارسی کے اچھے ادیب شاعر تھے اور اپنے اخلاق و خصایص کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ و ہر دلعزیز انسان تھے، اس لئے صبح و شام ایک اچھی خاصی مجلس شعر ار، امر و نظارہ کی برپا ہو جاتی تھی

شاعروں میں سے صرف ایک صاحب (نخومیان شفیق) کا نام مجھے یاد رہ گیا ہے، اور انکی یہ خصوصیت بھی یاد ہے کہ کان پر نیم کا تنکا (غالباً خلال کر نیکیلئے) ضرور رکھا رہتا تھا۔ ظفر میں سے ایک خاص سید باقر حسین تھے، انیون اور پیر ان کے نشاط زندگی کا جزو لازم تھیں۔ میں نے اس وقت تک ایسا دلچسپ و لطیف گفتگو کرنے والا انسان نہیں دیکھا۔ وہ بات بات پر انکی لطیفہ سنچیاں، شعر خوانیاں، خوش الحانیاں اور لکھنؤ کے صحیح ہلکالی محاورات کا استعمال مختصر آیوں سمجھتے کہ:-
”از اثر ناطقہ بندم طراز“

کی صحیح و مکمل تصویر تھے

الغرض وہ ماحول جو اوایل عمر میں یہاں پیدا ہو گیا تھا وہ میرے احاسات کے لحاظ سے ایسا پر لطف تھا کہ ہر وقت میرے دماغ پر نشہ سا چھایا رہتا تھا اور لکھنؤ کی ساری فضا کو اسی کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتا جس نے مجھے سرشار بنا رکھا تھا۔ یہ دوسرا دور تھا جو یہاں آکر ختم ہوتا ہے

دن گزرتے گئے اور رفتہ رفتہ میری عمر کے ساتھ پائیداریاں بھی کم ہوتی گئیں، یہاں تک کہ وہ زمانہ آیا جب والد نے اپنی خاص اصول تربیت کی بنیاد پر مجھے بالکل آزاد چھوڑ دیا اور یہی وہ تیسرا دور تھا جس نے مجھے بتایا کہ زندگی کسے کتے ہیں، شاعری کا خلاق کیا ہے اور بہت سے شاعرانہ الفاظ و تراکیب کا صحیح مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔

اس کے قبل فارسی ادبیات اور اردو شاعری کا جو مطالعہ میں نے کیا تھا، وہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی مرنے والے خیر کا درس صرف سامعہ کے ذریعہ سے دیا جائے۔ لیکن اب مجھے اجازت تھی کہ دیکھنے کی چیزوں کو دیکھوں، سننے کی باتوں کو سنوں اور اشیا چھونے کے لئے وضع ہوئی ہیں انہیں اپنے لمس سے محسوس کروں۔

اس سے قبل میں غالب کی ایک مثنوی کا یہ شعر ٹپھ چکا تھا:

جلوہ گرے آفتِ نظارہ برق ز مثال دے انگارہ

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرا استاد باوجود کوششِ بلیغ کے مجھے کبھی نہ سمجھا سکا کہ جلوہ گری کا صحیح مفہوم کیا ہے اور ”آفتِ نظارہ“ کس نوع کا استوب چشم ہے لیکن اب از خود اک الہامی کیفیت کے ساتھ نہ صرف یہی بلکہ:

”میانہا نازک دولہا تو انا“ کی حقیقت

”قیامت قاتماں مرگاں درازں“ کا مفہوم

”زرنگیں جلوہ ہا غارتگر ہوش“ کا علم مجھے حاصل ہو رہا تھا

بلکہ اس سے بھی زیادہ

”زہرہ را اندر داسے نور عیاں دیدہ ام“ اور

”کتان خویش می شویم بہ مستاب“ کے

مدارج و منازل سے گزر رہا تھا

الغرض لکھنؤ کے مطالعہ اولین کا آخری منظر جس طرح ختم ہوا وہ تو ایک ایسی چیز تھا جو ہر حال و صورت میں جائے دعوتِ برگے و نوائے کند

اور اس لئے جب میں یہاں سجدا ہوا تو میری حالت ایسی تھی جیسے ساون میں کسی کی بینائی نہایل ہو

میں نے لکھنؤ کو اپنی عمر کے جس خوشگوار موسم میں اول اول دیکھا اُسے

”زموج گل بہاراں بستہ زلزلہ“

کہنا چاہئے اور اسکا تعلق بالکل خود فراموشانہ اور اس لئے غیر ذمہ دارانہ زندگی سے تھا۔ اُس کے بعد بھی بار بار لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا لیکن بالکل مسافرانہ یا کبھی کبھی کسی خاص ضرورت سے مجبورانہ جس کو شاعری یا شاعرانہ احساس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مرتبہ جب میں نے مستقلاً یہاں قیام کا ارادہ کیا تو حالاتِ زندگی بالکل بدل چکے تھے، حیات کی مشکلات اور عاملانہ ذمہ داریوں نے بقول غالب

”زوشواری زلیستن مردہ“

بنادکھا تھا، نہ وہ فراغتِ خیال تھی، نہ آسودگی حال، نہ وہ جوش نشاط تھا نہ وہ سن و سال۔ ”فکر فضول“ کی جگہ ”مغورد تامل“ نے ”جرات زندانہ“ کی جگہ ”احترازِ پیرانہ“ نے لی تھی اور خیالات کے شیریں مالم سے ہٹ کر حقائق کی تلخ گزار دنیا میں آگیا تھا۔ بہر حال اس مرتبہ میرا لکھنؤ آنا نہ عہدِ گذشتہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے تھا اور نہ اس کا ماتم کرنے کے لئے،

بلکہ بجائے تماشائی کے، یہاں کی آبادی میں شامل ہو کر خود تماشائے گئے۔

اگر گزشتہ تین سال کا مسلسل قیام اور آئندہ کے لئے تابقائے حیات ہیں رہنے کا عزم راسخ، مجھے (اہل لکھنؤ تو خیر کیا) خادمان لکھنؤ میں شامل کر سکتا ہے، تو مجھ کو یہ حق غالباً حاصل ہے کہ باشندہ لکھنؤ ہونے کی حیثیت سے اپنے ان تجربات کا ذکر کروں جو اس وقت تک دوران قیام میں منجگو یہاں حاصل ہوئے۔

اب آپ اس مقالہ کے اولین فقرہ کی طرف پھر توجہ کیجئے جو خالص لکھنؤ کی آبادی کے ”عنصر سہ گانہ“ کے متعلق ہیں لکھا تھا۔ ہاں، تو ان تین عنصروں میں سے اس وقت مجھے جس سے بحث کرنا ہو ”عنصر شعراء“ ہے، یہیں اہل شعرا کو بھی شامل کر لینا چاہیئے۔

لکھنؤ کے شاعروں میں بڑا حصہ تو ان حضرات کا ہے جو یہیں کی خاک سے پیدا ہوئے یا یہیں کی سرزمین سے اپنے آپ کو منسوب کر کے لکھنؤی لکھتے ہیں (اس جماعت میں بعض وہ حضرات بھی شامل ہیں جو ہیں تو ضلع لکھنؤ کے کسی قریب یا دہلی کے، لیکن اپنے آپ کو ظاہر کرتے ہیں وہ لکھنؤی ہی) دوسرا چھوٹا حصہ ان بیرونی شاعروں کا ہے جو بسلسلہ ملازمت، تجارت یا تعلیم و تعلم وغیرہ یہاں مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم ہیں۔

گزشتہ تین سال کے اندر میں اسکو نہایت تکلیف سے ساتھ محسوس کیا کہ یہ دونوں جماعتیں، باوجود ہم مشرب مسلم ہونے کے ایک دوسرے کی حد درجہ مخالف ہیں اور کسی محفل میں ان دونوں کا اجتماع گویا دو متضاد عناصر کا اجتماع ہوا کرتا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ وہ دہقانی ہے، گنوارو، لکھنؤ کے محاورات، یہاں کی زبان اور یہاں کے لب و لہجہ سے کیا واقف ہو سکتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ

انچہ در گفتار فخر تست آں تنگ من ست

لکھنؤ میں آج تک کوئی شاعر پیدا ہی نہیں ہوا، یہاں کی سرزمین میں اس جنس بے بہا کی پیداوار کی اہمیت ہی نہیں ہے۔ تغزل نام ہے جذبات نگاری کا جس سے یہاں کے شعراء بالکل نا آشنا ہیں اور صرف رعایت لفظی کے چھوٹے ظلم میں اپنے آپ کو پھنساتے ہوئے ہیں۔

ہر چند میں اس وقت لکھنؤی وغیرہ لکھنؤی شاعری کے فرق و امتیاز پر بحث کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں، مگر جہاں تنقید کا تعلق ہے ضمنائے کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس مسئلہ میں دونوں زیادتی پر ہیں۔

اہل لکھنؤ کا ظلم تو یہ ہے کہ وہ یہاں کی فضا میں کسی بیرونی شاعر کا درخوردیکھ ہی نہیں سکتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی غیر کا ان کی فضا یا ان کے شہر میں غزل پڑھ دینا گویا ”باندازہ یک غزل“ انکی شہرت کو صدمہ پہنچانا ہے۔ اور اس کا انتقام لینے کے لئے وہ زبان، محاورہ وغیرہ کے دلائل سامنے لاتے ہیں جو اس وقت واقعی بالکل بے معنی سی بات ہے۔

غیر لکھنوی شعرا کی یہ زیادتی ہے کہ ان کو لکھنوی میں کوئی شاعر نظر ہی نہیں آتا اور زبان کی شاعری یا رعایت الفاظ کو وہ معمولی بات سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اس کو حاصل کر سکتا ہے علاوہ اس کے اگر جذبات نگاری ہی کو اصل چیز مان لیا جائے تو بھی اس کو مرنے یہاں کے شعراء اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ آجکل کے شعراء کے کلام میں مل سکتے ہیں۔
حال ہی میں رسالہ مبصر نے بعض لکھنوی شعراء کے کلام کا انتخاب دیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بعض بعض شعر بہت خوب ہیں مثلاً جناب آشفہ کے یہ اشعار:-

کوئی پوچھے دل وحشی سے حقیقت اسکی وہ جو اک چیز نظر آتی ہے ویرانوں میں
جلا کے خاک نہ کر دو نگا برق سے پہلے پروں میں آگ لگائے ہوں آشیان کیلئے
تو نے اُسے بھی لغزش منصور کھو دیا اک اعتبار تھارسن و دار پر مجھے
ایسا تلاش دوست نے بیگانہ کر دیا پہچانتی نہیں ہے کسی کی نظر مجھے
جذبات نگاری سے الگ ہٹ کر بھی خالص لکھنوی رنگ کے یہ اشعار جناب آشفہ کے برے نہیں:-
اپنی ہوس تو دیکھ کہ تو اور نگاہ ناز اے دل خدا کرے تجھے رسوا کرے کوئی
ہاں مرے دل پہ ابھی زخم ہے ناسور نہیں تم سلامت ہو تو وہ دن بھی کوئی دور نہیں
اس طرح منظر لکھنوی کے یہ اشعار ملاحظہ کیجئے

اے نیم سحری ڈھونڈھتی پھرتی ہے کسے اب کہاں جاگنے والا شب تنہائی کا
گلے تک یوں نہیں آیا ہے خنجر جفاؤں کو دفنا کہنا پڑا ہے
مجھے تو خندہ گل نے کیا تھا آپ سے باہر تمہیں نے بات بڑھ کر رکھ دیا ہوتا گریبان پر
قدیر لکھنوی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائے
اب مری آواز پر ادب خیر آواز دے سنتے سنتے تھک گیا ہوں میں کہ منزل ہے
شمس لکھنوی کہتے ہیں:-

روتے روتے ابھی آئی تھی ذرا دل کو ہنسی آپ نے پھر وہی ذکر دل ناشاد کیا
یہ کیا گیا کہ جدا ہو گئے گلے مل کے ابھی تو زخم بھی بھرنے نہ پائے تھے دل کے
یہ کس نے آتے ہی رخ سے اٹھا دیا ہے نقا کہ جھلملانے لگے سب چراغ محفل کے
ادھر نقشہ بھرا آنکھوں میں اور بجلی دھڑکی ہمیں اب خوف آتا ہے خیال آشیان کرتے
اب زینچا ہے نہ وہ بھیڑ خریداروں کی لے گیا لوٹ کے رونق کوئی بازاروں کی
سراج لکھنوی کا یہ شعر کیا داد طلب نہیں؟

وہ سزاوارہ یار کا زانو وہ شام وصل
البد بھر وہ خواب نہ آیا نظر مجھے
الغرض اسی طرح اور لکھنوی شعراء کے کلام میں بھی اچھے نمونے غزلگوئی کے مل سکتے ہیں۔ یہ اُن حضرات کا کلام ہے جو آجکل کے
نوجوان شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں، ورنہ کہنہ مشق شاعرانہ میں صفی، عزیز، اثر وغیرہ کا جو رنگ شاعری ہے اس کے
اچھا ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

الغرض بیرونی شاعروں کی بھی یہ زیادتی مجھے پسند نہیں کہ اُن کو بیان کی شاعری میں کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی ہے
چونکہ ضمناً شاعری کا ذکر آگیا تھا اس لئے اس سے زیادہ مجھے اس موضوع پر لکھنے کی ضرورت نہیں۔
میرا اصل مقصود بالکل اس سے علیحدہ صرف انسانیت، اجتماعیت، و اخوت کی بناء پر یہ عرض کرنا تھا کہ اگر کھڑی
دیر کے لئے شعر و شاعری کے جھگڑوں کو علیحدہ کر دیا جائے تو بھی ایک شتہ بیرونی و اندرونی شعراء میں فطرت کی طرف سے ایسا
قائم ہے کہ اگر اس کا پاس کیا جائے تو یہ باہمی مناقشت و منافست بہ آسانی دور ہو سکتی ہے اور مخالفت کی موجودہ صورت جو سب
شتم تک پہنچ گئی ہے بڑی حد تک صلاح کو قبول کر سکتی ہے۔

معین الادب، معراج الادب، خاصان ادب، لکھنوی، غیر لکھنوی، اور اسی طرح کے تمام بے معنی اصطلاحوں کو
جن سے بوئے تفریق آتی ہے یکسر مٹ جانا چاہئے اور سب کو یہ سمجھ کر کہ ایک جگہ کے باشندہ ہیں، ایک ہی فضا میں سانس
لے رہے ہیں، انسان پیدا ہوئے ہیں، نظام تمدن کے سلسلہ میں تعاون عمل ضروری ہے، رواداری و ایثار سے کام لے کر باہم مل جانا
چاہئے۔ شاعری سے زیادہ ضروری و اہم چیز وہ پاس انسانیت ہے۔ ایک شاعر اگر دوسرے سے اچھا ہے تو کوئی خوبی کی
بات نہیں۔ قابل فخر یہ امر ہے کہ کون "انسان" زیادہ ہے، اگر میرا شعر تقطیع سے گرتا ہے تو گرنے دیجئے مجھ سے نفرت نہ کیجئے
میرے عادات و اطوار کو دیکھئے کہ وہ تو انسانیت سے گرے ہوئے نہیں ہیں، اسی طرح اگر آپ کے تمام اشعار جو ابہر کی لڑیان
میں تو مجھے کیا اگر آپ کے اخلاق خذت ریزوں سے بدتر ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ بیان کی مختلف انجمنوں کا سررشتہ حیات و عمل کن ہاتھوں میں ہے اور بیرونی شعراء میں کس کو
دوسرے "ہونے" کا مرتبہ حاصل ہے، اس لئے میں تخصیص کے ساتھ کسی سے خطاب نہیں کر سکتا بلکہ عمومی طور پر ہر جماعت
و ہر جماعت کے ہر فرد کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ شاعری کی بے بود نمایش پر "حقیقتوں" کو پامال نہ کریں
و ایک دوسرے کے ساتھ ملکر زندگی بسر کرنا سیکھیں کہ وقت کی نزاکت اب اس سے زیادہ خطرناک مرکز پر نہیں پہنچ سکتی۔ پھر اگر یہ
مقصود ترک شاعری کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے تو میں اس کے ترک کا مشورہ دوں گا کیونکہ شاعری کا ماتم اس قدر سخت چیز نہیں ہے
بقدر انسانیت و اخلاق کا ماتم۔ اُس کے نہ ہونے سے تو صرف ہماری گرمی محفل پر اثر پڑے گا، لیکن اس کا فقدان تو ہماری موت،
و ہم کی موت اور روحانیت کی موت ہے، جو یقیناً حشر سے بھی بے نیاز ہے۔

میں باوجود سعی و ارادہ ابھی تک سفر دکن کے لئے طیارہ نہیں ہو سکا۔ اور اب آئندہ کے لئے ماہ و تاریخ کی تعیین کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں کیونکہ میرے اور خدا کے درمیان اکثر یہی معاملہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی برتری و خداوندی کو میرے عزائم توڑ کر ثابت کرتا ہے اور میں بھی ”علاج نیست داغ بندگی را“ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہوں

اس درمیان میں دکن کے جن احباب نے میرے اس عزم کا ذکر نگار میں دیکھ کر مجھے دعوتی خطوط روانہ کئے انکا شکریہ ادا کرتے ہوئے بہ ادب عرض کرتا ہوں کہ جب تک میں وہاں پہنچ نہ جاؤں، میرے کسی قول کا اعتبار نہ کریں، کیونکہ یہاں کے مشاغل جیسا نہیں چھوڑتے اور باوجود ہر ممکن کوشش کے میں ہنوز روانگی کا انتظام نہیں کر سکا۔ یہ یقینی ہے کہ میں ایک بار وہ خاک پاک دکن کی زیارت کر لگا ضرور، لیکن کب؟ اس کا جواب بجائے وعدہ کے ”ایفاء عہد“ سے دینا چاہتا ہوں، بشرط آنکہ ”عمر بے وفائی نہ کرے“۔ آرزو تو یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اخیر اگست یا اوایل ستمبر تک وہاں پہنچ سکوں

گزشتہ چند ماہ سے مسلسل نگار میں ”علمی و ادبی دعوت“ کے عنوان سے جو اعلان شائع ہو رہا ہے۔ اس کے متعلق میں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو حضرات ظفر یا ظفر کی شاعری کے متعلق لکھیں وہ واقعی محنت و تحقیق کا نتیجہ ہونا چاہئے، محض اس کی شاعری پر معمولی تبصرہ کافی نہ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ظفر کے متعلق جو مضمون ہو وہ سیرت نگاری و تنقید کا بہترین نمونہ ہو۔ سو روپیہ کا جو ہدیہ مقرر کیا گیا ہے اس سے مقصود صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ اس باب میں نگار اپنی پوری ذمہ داری کو محسوس کر رہا ہے، نہ یہ کہ وہ ارباب علم و ادب جنکا مرتبہ اس نوع کے حقیر ہدایا قبول کرنے سے بلند و رفیع ہے، ان کو اس طرح نایل کیا جا سکے۔ یہ میں نے اس لئے ظاہر کر دیا کہ مبادا رفیع المرتبت ہستیاں محض انعام یا ہدیہ کے خیال سے محفل ظفر میں شرکت کرنے سے ابا کریں

اس ماہ کی اشاعت میں پہلا مضمون سلسلہ کا ہے اور جس کی اہمیت کی طرف میں اس سے قبل توجہ دلا چکا ہوں۔ اگر یہ ترجمہ ترجمہ کی شان سے ہشکر پیش کیا جاتا تو زبان کی سلاست اور جملوں کے ربط میں زیادہ حسن پیدا ہو جاتا۔ بہر حال مفہوم اور معنی کے لحاظ سے یہ سلسلہ خاص چیز ہے ایک ماہ کے بعد پھر جناب مجنون گورکھپوری کا افسانہ شائع ہو رہا ہے جس کا سلسلہ آئندہ دو ماہ تک قائم رہے گا ناظرین نگار کے لئے چونکہ مجنون اور ان کے افسانے کوئی نئی چیز نہیں ہے اس لئے تعارف کی ضرورت نہیں دوسرا افسانہ وعدہ شکن، محشر عابدی کا ہے جو گولڈ اسمتھ سے لیا گیا ہے۔

تنقید فسانہ عجائب کے سلسلہ میں جناب نقاد نے اردو کے قدیم فسانوں پر نہایت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون آئندہ میں ختم ہو جائے گی رنجی گوئی پر جناب کلین کاظمی کا مضمون نہایت معقول ہے۔ حصہ منظومات میں فارسی کی نظم بہاریہ، ایران کے ملک الشعراء، مہر کی ہے جو طہران کے مشہور اخبار وطن سے نقل کی گئی ہے۔ مقبرہ ہمایون پر جناب محمود اسراہیلی نے بھی بہت پاکیزہ نظم لکھی ہے۔ غزلوں میں اختر شیرانی کی غزل کے بعض اشعار غایت درجہ شعرواقع ہوئے ہیں

حکومت برطانیہ کی وسعت کاراز

اور قبضہ ہندوستان کی لچرپستان

سلطنت ہند | اس سلسلہ میں نوآبادیات کی طرح سلطنت ہند سے اسی حد تک بحث کی جائیگی جہاں تک اس ستانوں توسیع کی تشریح ہوتی ہو جو انگلستان کی تاریخ کے حصہ جدید میں کارفرما ہے یعنی ہندوستان سے صرف اسی حد تک بحث کی جائیگی جہاں تک اس کا تعلق ہماری اپنی سلطنت سے ہے۔ اس پر تاریخی (یعنی اس کے اسباب وجود) اور سیاسی (یعنی اسکے فوائد یا استحکام) دونوں حیثیتوں سے روشنی ڈالی جائیگی۔

اس نقطہ نظر سے تاریخی ترتیب ملحوظ رکھنا ہمارے لئے آسان نہ ہوگا۔ ہم نے ہندوستان کو اندھون کی طرح حاصل کیا انگریزوں نے جتنے بڑے بڑے کام کئے ان میں کوئی اتنا اتفاقی اور غیر ارادی نہیں تھا۔ یقیناً نوآبادیات کے قیام میں ہم نے بہت کم فکر و ارادہ سے کام لیا۔ جب ہمارے قدیم باشندے درجنیا اور انگلینڈ جدید میں توطن پذیری کے لئے گئے تو ہمارا خیال کبھی نہیں تھا کہ ہم ایک بڑی جمہوری سلطنت کی بنا ڈالینگے۔ لیکن یہاں واقعہ نے اپنی نوعیت میں صرف مدارج سے اختلاف کیا ہے۔ ہم نے ایک جدید قومیت کی بنا کا خیال ضرور کیا تھا اور ہم کو یہ علم بھی تھا کہ اسکا میلان جمہوری ہوگا البتہ اسکی بے پایاں وسعت ہم سے مخفی تھی۔ لیکن ہندوستان میں ہماری عرض کچھ تھی اور ہو گیا کچھ۔ ہمارا مقصد تجارت تھا لیکن اس میں خصوصیت سے کامیابی نہیں ہوئی۔ ہم نے یہاں آنے کے ۱۰۰ برس بعد تک ویسی ریاستوں سے جنگ کا مطلق خیال نہیں کیا اور اسکے بعد بھی جو لڑائیاں ہوئیں وہ صرف ایسی ہی تھیں جسے ہمارے تجارتی اعراض کو تقویت پہونچتی تھی۔ اسکے بعد بھی تقریباً نصف صدی تک ہم کو ملک گیری کا خیال نہیں پیدا ہوا۔ انیسویں صدی شروع ہو چکی تھی جب ہم نے ویسی ریاستوں پر غلبہ حاصل کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ اور جو اعلیٰ مرتبہ آج ہم کو نصیب ہے لارڈ ڈلہوزی کی گورنر جنرلی سے قبل کا حاصل کردہ نہیں کہا جاسکتا۔ اسکو مشکل سے چوتھائی صدی کا عرصہ ہوا۔ ہم برابر تاکتے رہے دوسری طرف اور چلتے تھے دوسری طرف۔ اس صورت میں تاریخی ترتیب کیساتھ مطالعہ کرنا بدترین انتخاب ہوگا اگر ہم ایسٹ انڈیا کمپنی کی سال بسال تاریخ کا پتہ ڈالرکٹران کمپنی کے نقطہ خیال کے مطابق لگانا چاہیں تو گویا ہم اپنے کو بالکل اندھا تسلیم کرینگے کیونکہ وہ توہین جن کی بدولت سلطنت ہند معرض وجود میں آئی۔ ہمیشہ ڈالرکٹران کی مرضی پر غالب رہیں اگرچہ

ڈاکٹر کٹر ان نے ان قوتوں کا سخت مقابلہ بھی کیا لیکن بیکار۔ اس سبب سے یہ نہایت ضروری ہے کہ دوسرے سرے سے آغاز کیا جائے اور یہ دریافت کرنے سے قبل کہ سلطنت اس موجودہ عظمت کو کس طرح پہنچی ہم معلوم کریں کہ درحقیقت اسوقت یہ کیا ہے۔

ہم اس سلطنت کو ایک مفتوح سلطنت کہتے ہیں تاکہ یہ امتیاز ہو جائے کہ ہم نے بحیثیت نوآبادی کے اسکو نہیں حاصل کیا ہے بلکہ کمپنی کو متواتر لڑائیوں میں دیسی ریاستوں سے یہ ملک ملا ہے۔ لیکن کیا ہمیں یقین ہے کہ اس موقع پر لفظ ”فتح“ استعمال کرنا درست ہوگا۔

میں نے اس سے پہلے ”مقبوضات انگلینڈ“ اصطلاح پر اعتراض کیا تھا جو عام طور پر نوآبادیات کے لئے مستعمل ہے۔ میں نے سوال کیا تھا کہ اگر انگلینڈ سے مراد وہ لوگ ہوں جو انگلینڈ میں آباد ہوں اور نوآبادیات سے وہ چند انگریزی قومیں مراد ہوں جو سمندر پار بستی ہوں تو کس طرح ان میں کی ایک آبادی دوسری کی ملک ہو سکتی ہے۔ یا اگر انگلینڈ سے تم سلطنت انگلشیہ مراد لیتے ہو جو خود نوآبادیات کی بھی حکومت ہے تو ہم کیوں ایک حکومت کی رعایا کو اسکی مقبوضہ یا ملک کہیں ایسی حالت میں کہ وہ مفتوح ہو کر رعایا نہیں ہوں ہو یہ اعتراض براہ راست ہندوستان پر نہیں عائد ہوتا کیونکہ یہ ملکہ وکٹوریہ کی حکومت میں فتح ہو کر آیا۔ اس طرح ہندوستان انگلینڈ کی ملک ہو سکتا ہے لیکن اس معنی میں نہیں جس معنی میں کہ نوآبادیات ہیں۔ تاہم لفظ ”فتح“ مثل دیگر لغات حرب کے نہایت قدیم زمانہ کا لفظ ہے اسلئے ممکن ہے کہ اسکے مفہوم میں غلطی ہو جائے۔ پھر بھی ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کس معنی میں انگلینڈ کی ملک ہو سکتا ہے۔ جو چیز ہمارے قبضہ میں ہوتی ہے ہم اسکو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔ اگر میرے پاس کچھ زمین ہے تو میں یا تو خود اس کی فصل سے منافع اٹھاؤں گا یا اگر لگان پر دیدن تو اسکا لگان پاؤں گا۔ زمانہ قدیم میں بھی کسی ملک کے فتح کرنے سے ہی مطلب سمجھا جاتا تھا کہ فاتح نے واقعی کسی چیز پر اپنا قبضہ کیا ہو۔ بعض اوقات ایسا ہوا۔ کہ فاتحین ملک مفتوحہ یا اسکے ایک جزو کے تعلقہ دار ہو گئے جیسا کہ اُس فتح بیت المقدس میں ہوا جبکہ حال بائبل کی کتاب یسوع میں درج ہے یا اُن فتوحات روم میں جن میں ضبط شدہ زمین کا کچھ حصہ اکثر چند رومی شہریوں کو دیدیا جاتا تھا۔ یقیناً ہندوستان اس معنی میں مفتوح نہیں کہا جاسکتا۔ انگلینڈ نے ہندوستان کی زمین پر قبضہ نہیں کیا اور نہ دیسی زمینداروں کو اُس سے بیدخل کر کے انگریزوں کے قبضہ میں دیا۔

اس کے علاوہ ایک اور مفہوم بھی مفتوحہ ملک، سے متبادر ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ باغزار ہو البتہ اسکا لحاظ ضرور رکھنا چاہئے کہ ہم اس اصطلاح سے کیا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اگر اس سے یہ مراد ہو کہ اہل ملک ٹکس ادا کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر اپنی حکومت یا سرحدی فوجوں کے اخراجات برداشت کرتے ہیں تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مفتوح قوم کے لئے عجیب ہو۔ تقریباً تمام قومیں کسی نہ کسی صورت میں اپنی حکومت کے اخراجات کی کفیل ہوتی ہیں۔ اگر لفظ

با جگزار، مفتوح، یا، محکوم، کا مترادف ہو تو یقیناً اسکے معنی یہ ہونگے کہ اہل ملک علاوہ اخراجات حکومت کچھ اور بھی ادا کرتے ہیں۔ اسکی مثال مصر جدید میں تم کو ملیگی۔ مصر کی حکومت ایک خدیو کے ہاتھ میں ہے جو قوم کے روپیہ سے اپنی جیب بھرتا ہے۔ لیکن مصر سلطان ٹرکی کا با جگزار ہے یعنی مصر سلطان کو ایک معقول رقم نذر کرتا ہے جو کسی دوسری شکل میں ملک میں واپس نہیں آتی۔ بلکہ سلطان کے ساتھ مصر کا رشتہ محکومیت ظاہر کرتی ہے۔

ایسا خراج صاف طور سے بتاتا ہے کہ اسکا ادا کرنے والا لینے والے کی ملک ہے۔ کیونکہ یہ جبنسہ وہی صورت ہے جس میں ایک کاشتکار اپنے زمیندار کو لگان دیتا ہے۔ کیا ہندوستان اس معنی میں انگلینڈ کا با جگزار ہے؟ ہرگز نہیں کم از کم براہ راست یا مسلمہ طور پر تو نہیں۔ ہندوستان کی طرح انگلینڈ میں بھی ٹکس وصول کیا جاتا ہے۔ تو کیا انگلینڈ کو با جگزار کہا جائیگا۔ ہندوستان سے جو روپیہ کھینچا جاتا ہے وہاں کی حکومت پر صرف کیا جاتا ہے اور ضروری اخراجات کے علاوہ ایک کوڑی بھی نہیں لی جاتی۔

البتہ یہ امر قابل بحث ہو سکتا ہے اور اکثر ہوا بھی ہے کہ ہندوستان اور مختلف صورتوں میں انگلینڈ پر قربان کیا جاتا ہے خصوصاً رنگ برنگ کی جیلہ سازیوں سے اسکی دولت انیٹھی جاتی ہے۔ مجھے اس وقت اس سوال سے کوئی بحث نہیں کیونکہ میں محض یہ دریافت کر رہا ہوں کہ قانوناً ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان کون سا رشتہ ہے مجھے اس سے تعرض نہیں کہ بددیانتی سے کہاں تک اس رشتہ میں پیچیدگی پیدا کر دی گئی ہے۔ لہذا ہندوستان اس معنی میں کہ وہ اصولاً انگلینڈ کا با جگزار ہے کبھی موخر الذکر کی ملک نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہماری تو آبادیات زیادہ کھلانے کا مستحق ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ ہندوستان اور انگلینڈ کا موجودہ رشتہ تاریخی حیثیت سے صرف لڑائی کی بدولت پیدا ہوا لیکن انگلینڈ نے کبھی، کم از کم علانیہ، ہندوستان پر اپنا یہ حق نہیں ظاہر کیا۔ ملکہ وکٹوریہ کے فرمان خسرو کی نو برصغیر عزمین حبکی رو سے علیا حضرت نے اپنی حکومت کا بالا اعلان اظہار کیا، یہ صاف اور صریح الفاظ موجود ہیں ”ہم پر جو فرائض اور پابندیاں ہماری دوسری رعایا کی طرف سے عائد ہوتی ہیں بالکل وہی مملکت ہند کے باشندگان کی طرف سے بھی ہم پر عائد ہیں اور ہم ان فرائض کا اپنے کو مکلف سمجھتے ہیں“، یعنی فتح کی وجہ سے کسی کو مخصوص استحقاق نہیں حاصل ہوتے یا بالفاظ دیگر لوں کہے کہ ہندوستان علی اغراض کے لئے مفتوح ملک نہیں ہے۔

اگرچہ تہذیب و تمدن کی ترقی نے نہ تو جنگوں کا سلسلہ یک قلم موقوف کیا اور نہ کم، تاہم اپنی نوعیت میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ نام نہاد فتح اب بھی ممکن ہے۔ لیکن اس لفظ کے اب وہ معنی نہیں رہے۔ آج کل کسی مستبد ملک کے استیصال یا تغیر کا نام فتح نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اب فتوحات کی حرص و تمنا میں نمایاں کمی واقع ہو گئی ہے۔ الغرض ہندوستان پر قبضہ کی وجہ سے ہم پر بہت اور ناقابل تحمل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ لیکن یہ امر کہ بسم کو ہندوستان سے

کوئی نفع ہے پہلی نظر میں نہیں واضح ہوتا۔

لہذا ہمیں اپنے دماغ سے اس خیال کو نکال دینا چاہئے کہ ہندوستان عملی معنوں میں انگلینڈ کی ملک ہے عام محاورہ میں ملکیت اور حکومت دونوں کے مفہوم اس قدر مخلوط ہیں کہ خواہ مخواہ الجھن پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم ہندوستان کو اپنا ایک "عائیشان محکوم ملک" کہتے ہیں یا اسکو انگریزی جواہر خانہ کے سب سے بیش قیمت اور خوش حال محل سے تشبیہ دیتے ہیں تو یہ صرف ایک استعارہ ہوتا ہے جو زمانہ قدیم سے اب تک مستعمل ہوتا چلا آیا ہے حالانکہ اب وہ قدیم سوسائٹیاں ایک گزشتہ چیز ہو گئی ہیں۔ ہندوستان اس معنی میں البتہ انگلینڈ کا محکوم ہے کہ اسکی قسمت اور پالیسی انگریزوں کے اختیار میں ہے اس معنی میں نہیں کہ وہ انگلینڈ کی کوئی خدمت کرتا ہے یا بلا واسطہ انگلینڈ کو قوی تر یا زیادہ مالدار بناتا ہے۔ ٹھیک نوآبادیات کی طرح ہندوستان کا مسئلہ بھی جب ہمارے سامنے آتا ہے تو بھی سوال پیدا ہوتا ہے "آخر اس سے کیا فائدہ ہے؟" ایشیا کے ہر کڑوڑ باشندہ پر حکومت کرنیکی ذمہ داری اور پریشانی ہم کیوں اپنے اوپر لئے ہوئے ہیں؟

یہ سوال نوآبادیات کے لئے الجھاؤ ہے اگرچہ قدرتی طور پر ایسا نہ معلوم ہوتا ہو۔ البتہ اس صورت میں الجھاؤ نہ ہوگا جب یہ ثابت ہو جائے کہ نوآبادیات ہم سے اتنی دور واقع ہیں کہ اُن سے افادہ یا استفادہ بالکل ناممکن ہے نوآبادیان ہماری ہی نسل سے ہیں۔ صرف انگریزی قومیت نئی آبادیوں میں پھیل گئی ہے۔ اگر یہ ممالک انگلینڈ سے ملحق ہوتے تو انگریزی آبادی جون جون بڑھتی ان پر پھیلتی جاتی اور بظاہر یہ مناسب بھی ہوتا بشرطیکہ سیاسی علیحدگی کی نوبت نہ آتی۔ لیکن چونکہ وہ ملحق نہیں ہیں بلکہ بہت دور واقع ہیں اسلئے کچھ دشواریاں پیدا ہوتی ہیں لیکن برقی اور دھاتی ایجادات کے زمانہ میں ان دشواریوں پر غالب آنا مشکل نہیں ہے۔ تم نے دیکھا کہ یہ دلیل انگلینڈ اور اسکی نوآبادیات کے لئے ٹھیک ہے کیونکہ ان دونوں ممالک میں خون کا اتحاد ہے۔ ہندوستان کے متعلق یہ دلیل ناموزون ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں سے زیادہ شاید ہی کوئی دو قومیں اس درجہ ایک دوسرے سے مغایرت رکھتی ہوں۔ البتہ تاریخ علم السنہ نے ایک ایسا رشتہ ان دونوں قوموں میں ڈھونڈ نکالا ہے جسکا آج سے قبل کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ جو زبان ہندوستانی قوموں میں مروج ہے وہ ہماری ہی زبان کے خاندان سے ہے۔ لیکن اور دوسرے اعتبار سے انہیں شدید ترین مغایرت ہے۔ انکے رسم و رواج ہم سے بالکل مختلف ہیں۔ اسلام سے کہیں زیادہ غیریت انکے مذہب کو ہمارے مذہب سے ہے۔

ہماری نوآبادیات زیادہ تر کہ زمین کے غیر آباد حصوں میں قائم ہوئیں راسی وجہ سے انکی پوری یا غالب آبادی انگریزی ہے۔ میں نے یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ یہ صورت اسپین کی ان نوآبادیات کی نہیں ہے جو وسطی اور جنوبی امریکہ میں قائم ہوئیں کیونکہ اسپینی نوآبادوں کی تعداد کم تھی غالب حصہ آبادی سرخ انڈین کا تھا جن کو

ان لوگوں نے بالکل غلام بنالیا تھا۔ یہاں پر اب نوآبادی کی دو قسمیں ہوئیں جن میں سے ایک بہ نسبت دوسرے کے مادر وطن سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن دونوں قسم کی نوآبادیان رشتہ کھون سے مادر وطن سے منسلک ہیں۔ ہندوستان ان دو قسموں میں سے کسی میں نہیں آتا۔ کیونکہ اسکی آبادی کا کوئی خونی تعلق انگلینڈ سے نہیں ہے۔ اگر انگلینڈ کے توطن پذیر ہندوستان میں جا کر آباد بھی ہوتے تو انکی کچھ حقیقت نہ ہوتی کیونکہ ہندوستان کی دلیسی آبادی انکے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوتی۔ قدرت نے ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایسی مستحکم حد فاصل قائم کر دی ہے کہ ہندوستان انگلینڈ کی نوآبادی ہو ہی نہیں سکتا۔ قدرت نے یہاں کی آب و ہوا ایسی بنا دی ہے کہ اس میں انگریز نشوونما نہیں پاسکتے۔

جس طرح انگلینڈ کا تعلق اسکی نوآبادیات سے بالکل قدرتی معلوم ہوتا ہے اسی طرح ہندوستان کے ساتھ اسکا تعلق پہلی ہی نظر میں قطعی غیر قطری معلوم ہوتا ہے۔ ان دو ممالک میں کوئی قدرتی رشتہ اتحاد نہیں ہے۔ نہ تو نسلی اتحاد نہ مذہبی کیونکہ ہم عیسائی اور وہ ہندو اور مسلمان اور نہ اتحاد مقاصد بجز ان عام مقاصد کے جو ایک ملک کو دوسرے سے ہوتے ہیں یعنی سامان تجارت کی درآمد و برآمد۔ تم خود سوچو اسکے علاوہ انگلینڈ اور ہندوستان درمیان کون مشترکہ غرض ہے۔ انگلینڈ کی اغراض زیادہ تر یورپ اور دنیا جدید سے وابستہ ہیں۔ ہندوستان ایسے الگ تھلک ملک کا کوئی بیرونی تعلق اگر ہو سکتا ہے تو فارس، افغانستان اور وسط ایشیا سے ہو سکتا ہے جسے براہ راست ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے البتہ ہندوستان کے توسط سے۔

ہندوستان کی فتح نے اسپینوں کی فتح امریکہ سے زیادہ تعجب خیز نتائج پیدا کئے اگرچہ میرا خیال ہے کہ اسکے اسباب نسبتاً بہت کم حیرت انگیز تھے۔ یہ واقعہ انگلینڈ کی تاریخ جدید میں نہایت نمایاں ہے چاہے ہم کچھ خیال کریں اگرچہ ہمارے مورخین اس واقعہ پر اتنی توجہ نہیں مبذول کرتے جتنی اسکے شایان شان ہے۔ تاہم انگلستان کی تاریخ جدید میں اسکو اہمیت خصوصی حاصل ہے۔ لیکن اس وقت تک ہمیں اسکی اہمیت کا اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک ہم اپنے دماغ سے اسکی غرابت کا خیال نکال کر اسکی بے پایاں وسعت پر نظر نہ رکھیں۔ اسکے متعلق بہت خامہ فرسائی ہو چکی ہے کہ ہندوستان کا بڑا بھاری فرض ہمارے ذمہ ہو گیا ہے لیکن اس سے کوئی نتیجہ مشکل پیدا کیا جاتا ہے۔ جب عدد و شمار ایک خاص حد سے متجاوز ہوتے ہیں تو ہمارے تخیلات میں رعب آجاتا ہے۔ اپنی خانگی سیاست میں جب ہماری دلچسپی زیادہ بڑھتی ہے تو اسی نسبت سے مسئلہ تنقیح طلب کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن جب ہماری سلطنت کے وسیع مسائل ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہماری دلچسپی غائب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ سلطنت ہند کی مثال سلطنت روم کے اس دور کی سی ہے جب موخر الذکر ترقی کے اعلیٰ ترین پر تھی اور یہ کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں، تو ہماری طبیعت پھر جاتی ہے اور اس مضمون کے مطالعہ کو جی نہیں چاہتا۔

کیا واقعی ہم ایسا کرنے میں حق بجانب ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہم ایک حد تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دنیا کے طرفی ممالک کی وسعت یا تنگی سے کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ اس طرح سے اگر ہندوستان وسیع ملک ہے تو کناڈا اور ہٹریلیا اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں لیکن ان کے امور ہماری توجہ کے اتنے زیادہ محتاج نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن ایک خاص مابہ الامتیاز شے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کناڈا اور اسٹریلیا رقبہ میں تو بڑے ہیں لیکن انکی آبادی بہت مختصر ہے۔ یہ ممالک ہندوستان کی طرح ہم سے دور ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ان بڑی سلطنتوں سے بھی دور واقع ہیں جسے ہمیں جنگ کا امکان ہو۔ ہندوستان کی بالکل مختلف حالت ہے۔ آبادی کے لحاظ سے وہ یورپ کی طرح گنجان ہے بلکہ بعض حصے تو یورپ سے بھی زیادہ گنجان ہیں۔ یہ وہ ملک ہے جس میں ہکو بار بار اعلیٰ اعلیٰ پیمانہ پر جنگ کرنا پڑی۔ مرہٹوں کی دوسری لڑائی میں ۱۸۱۸ء لارڈ ہسٹنگز کی فوج ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ہندوستان کتنی ہی دور واقع ہو لیکن یہ یورپ کی سیاست سے باہر نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی میں یہ ایک شطرنج کی بساط تھا جس پر شاطران فرائس و انگلینڈ نے اپنی ہنرمندی دکھلائی۔ اور صرف ہندوستان ہی کی بدولت سترہم سے ہمارے اور اس کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اس وقت سے ہکو مشرق کے معاملات سلجھانے سے خاص تعلق پیدا ہو گیا ہے۔

اگر ہندوستان کو تشبیہ دیا جاسکتی ہے تو ممالک یورپ سے نہ کہ دنیا کے جدید کے دور افتادہ غیر گنجان ممالک سے۔ ہم اس ملک کے طول و عرض کا خیال اپنے دماغ میں قائم کرین پھر اس کا مقابلہ کسی ایسے ملک سے کریں جس سے ہم واقف ہوں ماسوائے یورپ کے اس حصہ کے جو چند صدی قبل تمدن تاریخ گوارہ تھا اور جس کے اندر سلطنت روم کے تمام یورپی ممالک معہ جرمنی اور (Scandinavian) ریاستیں شامل ہیں ہندوستان سے شاید ہو سکتا ہے۔ ہندوستان بلحاظ آبادی و رقبہ ان تمام ملک کے جمہوریہ کے برابر ہے۔ وہ سلطنت جس پر ہم ڈاؤننگ اسٹریٹ سے بیٹھ کر حکومت کرتے ہیں اور جس کا بجٹ ہر سال دارالعلوم میں پریشانیوں اور ناامیدیوں کا باعث ہوتا ہے نیو لین کی سلطنت سے کمین بڑی ہے۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں یہ ملک جنوبی امریکہ کی قدیم اسپینی یا ستون کی طرح غیر آباد اور وسیع نہیں ہے بلکہ ایک گنجان آباد خطہ ہے جسکی تہذیب نہایت قدیم ہے جو خود اپنے مذاہب، زبان، فلسفہ اور ادبیات کا مالک ہے۔

اگر ہندوستان کو کسی حصوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے تو اسکے سمجھنے میں آسانی ہو جائیگی۔ یورپ کا خیال ہم پر کیوں اتنا اثر کرتا ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ جہاں یورپ کا نام لیا گیا فوراً ہمارے دماغ میں اسکی تمام بڑی ریاستوں کا تصور آگیا جو تعداد میں ۶۱۶ ہیں۔ یورپ کا تصور انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا، اٹلی، اسپین اور یونان کا مجموعی تصور ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان بھی ایسی ہی چھ بڑی سلطنتوں کا مجموعہ ہوتا تو اسکا تصور ہکو بڑا معلوم ہوتا۔ میں ایک بات یہاں پر ظاہر کر دیتا چاہتا ہوں۔ ہندوستان میں صرف ایک ایسا خطہ ہے جو آبادی میں

یورپ کی ہر سلطنت سے ماسوائے روس کے اور اضلاع متحدہ امریکہ سے بڑا ہے۔ یہ علاقہ لفٹنٹ گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ اسکی آبادی ۶ کروڑ ۶۰ لاکھ ہے حالانکہ اسکا رقبہ فرانس سے بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ دو اور ایسے خطے ہیں جو یورپی ریاستوں کے مقابلہ کے ہیں۔ یہ شمالی مغربی صوبے ہیں جو برطانیہ کلان ماسوائے آئرلینڈ کے مقابل ہو سکتے ہیں۔ البتہ رقبہ میں کچھ کم ہیں مگر آبادی انکی زیادہ ہے۔ پھر احاطہ مدراس ہے جو رقبہ میں تو برطانیہ کلان بشمول آئرلینڈ کے برابر ہے لیکن بلحاظ آبادی کم آباد ہے اور ملک اٹلی کے برابر ہے ان تینوں صوبوں کی آبادی ۲ کروڑ سے بہت زیادہ ہے۔ انکے علاوہ دو اور صوبے ہیں جنکی آبادی بھی قریب قریب ۲ کروڑ ہے۔ ایک تو پنجاب ہے جو بلحاظ آبادی اسپین سے کسی قدر بڑا ہے اور دوسرا احاطہ بمبئی جو کسی قدر چھوٹا ہے لیکن رقبہ میں برطانیہ کلان اور آئرلینڈ سے بڑا ہے۔ دوسرے درجہ پڑاودہ ہے جو بلجیم اور ہالینڈ کے مجموعی رقبہ سے کچھ بڑا ہے اور پھر صوبہ متوسط ہے جو ان دونوں ملکوں کے برابر ہے۔ ان صوبہ جات اور نیز دیگر مشہور اضلاع کے مجموعہ کا نام ہندوستان ہے جو براہ راست گورنمنٹ برطانیہ کے زیر حکومت ہے۔ لیکن وہ خطہ جو عملاً برطانوی سیادت کے اندر ہے اس سے بھی بڑا ہے۔ سلطنت بنولین سے ہماری مراد صرف انھیں مالک سے نہیں ہوتی جو براہ راست اسکے عمال کے زیر حکومت تھا بلکہ اسکے اندر وہ ریاستیں بھی تھیں جنکے فرمانروا برائے نام تھے اور عملاً وہ بنولین کی ماتحت تھیں۔ چنانچہ جمعیت راہن جس میں متعدد جرنی پائین شامل تھیں باضابطہ آئین کی رو سے بنولین کو اپنا محافظ تسلیم کرتی تھی۔ اسی طرح ہندوستان میں انگلینڈ کی ایک اور ماتحت جمعیت ہے یعنی خود مختار ریاستیں جو باعتبار آبادی امریکہ سے بڑی ہیں۔

کیا یہ صحیح ہے کہ علاوہ اپنی خوفناک کثیر آبادی کے جسکی سیاست نہایت پریشان کن ہے اور علاوہ اپنی وسیع نوآبادیات کے ہم ہندوستان کے بھی ذمہ دار ہیں جسکی آبادی یورپ کے برابر ہے۔ کیا واقعی یہ بھی سچ ہے کہ ہکو اس کے متعلق نہایت معمولی واقفیت بھی نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اگر ہکو یہ واقفیت حاصل بھی ہو جائے تو ہم ایسے پیچیدہ اور بعید معاملات کے متعلق کوئی صائب رائے قائم کر سکتے ہیں؟

اس سے پہلے بڑی بڑی سلطنتیں گزر چکی ہیں جنکی عنان حکومت صرف چند تجربہ کار شخصوں کے ہاتھ میں تھی روم کو مجبوراً اپنی سلطنت ایک غیر ذمہ دار مدبر کی حفاظت میں دینا پڑی یہاں تک کہ وہ اپنی قدیم معاشرتی آزادی بھی کھو بیٹھا۔ امریکہ میں البتہ باوجود اس غیر محدود وسعت کے جمہوری حکومت قائم ہے۔ اگرچہ یہ ملک بہت وسیع ہے لیکن مربوط اور مسلسل ہے، اسکی آبادی کتنی ہی زیادہ ہو جائے لیکن ہمیشہ متحد رہیگی۔ اگر امریکہ ایسے ملک کے قبضہ میں آجائے جو اس سے بذریعہ سمندر الگ ہو اور اسکی قومیت بھی مختلف ہو تو پھر اسکی پوزیشن دنیا میں فوراً بدل جائیگی۔ ہندوستان اور انگلینڈ کے رشتہ میں جو بات سب سے زیادہ انوکھی ہے وہ یہ ہے کہ انگلینڈ ایک ایسے ملک پر حکومت کر چکی کو شش کرتا ہے جسکی آبادی صرف دو رہی نہیں واقع ہے بلکہ حکمران قوم سے کلیتہً مخالف ہے

اور طرز حکومت بھی جمہوری ہے شخصی نہیں۔ رائے عامہ عام طور سے چند سیدھے اور سہل خیالات پر مبنی ہوتی ہے جب ملک کی اغراض سادہ اور حکومت کے اصول ناقابل خطا ہوں تو رائے عام بڑے بڑے مسائل کا بھی تصفیہ بغیر خطرہ کے کر سکتی ہے۔ لیکن جب سیاسی چالاکینوں اور موٹسگانیوں کی نوبت آتی ہے ایک اصول چھوڑ کر دوسرا اصول کام میں لانا پڑتا ہے تو رائے عامہ ششدر ہو جاتی ہے۔ اور ایسے ششدر کن معاملات ہماری سلطنت ہند میں پیدا ہوتے رہتے ہیں ہندوستان اپنی نوعیت میں تو آبادیات اور خود انگلیڈ سے اتنا جداگانہ واقع ہوا ہے کہ اُسکے لئے سرتاپا مختلف طرز حکومت کی ضرورت ہے۔ اسی لئے رائے عامہ حیران ہے کہ کیا کرے وہ حکومت کو جو اپنے طرز میں قطعی غیر انگریزی ہے نہایت غضب آلود اور مایوس نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ ایسی حکومت جو مستبد ہے جو ایک حکمران قوم کے ہاتھوں میں ہے جس کا قیام فوجی طاقت پر ہے جسکے محاصل یورپین طریقہ پر نہیں وصول کئے جاتے بلکہ نمک اور افیون کی اجارہ داری سے جسکی حیثیت ایک عالمگیر تعلقہ دار کی ہے الغرض جو انگلیڈ کی روایات سے سیکڑوں بات میں مختلف ہے۔

ہم سے سوال ہو سکتا ہے "آخر اس سے فائدہ" جیسا کہ میں نے کہا ہے اس تعلق سے براہ راست ہمو کوئی نفع نہیں ہے اب ہمو دیکھنا چاہئے کہ آیا اس سے کوئی ضمنی فائدہ بھی ہے یا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ایک تجارت ہے جو رفتہ رفتہ دونوں ملکوں کے درمیان اعلیٰ پیمانہ پر پوپنچ گئی ہے۔ اگر ہندوستان میں ہمارے خلاف بغاوت رونما ہو جائے یا ہندوستان ایسی حکومت کے قبضہ میں آجائے جو تمام بندرگاہوں کو ہم پر بند کر دے تو چھ کروڑ پونڈ سالانہ کا ہمارا نقصان ہوگا۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کی تجارت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اُس بار کے مقابلہ میں جو ہندوستان کی بدولت ہماری خارجی حکمت عملی پر پڑتا ہے یہ نفع کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ آج کل محکوم ممالک کو فوجی طاقت کے روز سے قبضہ میں رکھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی قوم کے گلے میں چکی کا پاٹ باندھ دیا جائے۔ کیونکہ اس طرح فاتح قوم کو ہمیشہ ایک فوج محفوظ رکھنا پڑتی ہے کہ شاید کسی وقت اپنے تحفظ یا دیگر اغراض کے لئے اسکی ضرورت پڑ جائے۔ ہم جانتے ہیں اسوقت بسا رک کس اطمینان سے افریقہ اور ایشیا میں فرانس کو فتوحات کی تدابیر میں مشغول دیکھ رہا ہے۔ اگر انگلیڈ کو، جو یقیناً فوجی سلطنت نہیں ہے، ۲۰ کروڑ باشندوں کو بذریعہ فوج محکوم رکھنا ہو تو میرے خیال میں اسکے اظہار کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ بار ہمارے لئے ناقابل برداشت ہوگا۔ مگر ایسا نہیں ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ سلطنت ہند میں ایک بنیادی خصوصیت ہے جس پر آئندہ میں مفصل بحث کرونگا۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ انگلیڈ نے ہندوستان کو فتح تو کیا لیکن اب ہندوستانی ہی فوج سے اسپر قابض ہے اور لطف یہ کہ فوج کی تنخواہ بھی ہندوستان ہی دیتا ہے۔ ہماری انگریزی فوج ہندوستان میں صرف ۶۵۰۰۰ ہے لیکن صرف یہی بارہم پر نہیں ہے۔ ایک طرف وہ ہماری فوج کو مقفل رکھتا ہے تو دوسری طرف ہماری خارجی پالیسی میں دو چند مشکلات پیدا کرتا ہے۔ کسی ملک کی کماں مسرت یہ ہے کہ وہ قانع رہے دوسری قوموں سے کوئی مطلب نہو۔ دانشگاہ کی یہ نہایت

دانشمندانہ نصیحت اپنے ہمعومون کو تھی کہ جب تک ہو سکے تم اس حقیقی مسرت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ انگلینڈ کی یہ قسمت نہیں تاہم اگر ہندوستان اُسکے قبضہ میں نہ ہوتا تو نسبتاً اسکو اس حقیقی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا۔ ہماری نوآبادیات کے باشندے زیادہ تر یا تو امن پسند ہیں یا قطعی وحشی اور اب یورپین جہد میں ہمارے پرانے مفاد ختم ہو چکے ہیں البتہ مشرق میں ہمارے تعلقات بہت گہرے ہیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے مجبوراً ہم ترکی کی ہر تحریک، مصر کی ہر نئی بات اور ایران، برہما اور افغانستان کی ہر نئی کردٹ کو نہایت ہوشیاری سے دیکھتے ہیں۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ ہندوستان پر ہمارا قبضہ ہے۔ محض اسی وجہ سے دول ایشیا میں ہماری پوزیشن ممتاز ہے اور ان تمام ممالک کے معاملات سے جو ہندوستان کی راہ میں حائل ہیں ہلکو خاص دلچسپی ہے۔ محض ہندوستان کی بدولت دوس سے ہمنے دائمی رقابت مول لی اور یہ رقابت انیسویں صدی میں انگلینڈ کے لئے بجنسہ ویسی ہی جیسی اٹھارہویں صدی میں دنیا سے جدید کی خاطر فرانس سے تھی۔

میری غرض اس لکچر سے یہ ہے کہ ہمارے سامنے ہندوستان کے مسئلہ کا خاکہ پیش کر دوں میں نے شروع میں چند ایسی باتیں بیان کی ہیں جن سے شاید تم اس مسئلہ کے متعلق کوئی پریشان کن یا مایوسانہ خیال قائم کرو۔ اگر یہ امر مشتبہ ہے کہ ہندوستان سے ہمیں کوئی فائدہ ہے اور یہ حقیقت بالکل غیر مشتبہ ہے کہ اسکی وجہ سے ہم ایسی ذمہ داریوں میں پھنسے ہیں کہ ہمارا دماغ یا اس انگیز مشکلات سے مختل ہو رہا ہے تو کیا اس ساعت کو ہم انگلینڈ کے لئے ایک منحوس گھڑی کہنے میں حق بجانب ہونگے جب کلہو کی بے خوف عالی دماغی نے ایک تجارتی کمپنی کو سیاسی سلطنت میں تبدیل کر دیا اور سیکڑوں سال کے لئے مسلسل لڑائیوں کی بنیاد ڈال دی؟ کیا ہم ان ممتاز سیاست دانوں کی طرح جنھوں نے اپنی زندگی ہندوستانی معاملات میں گزاری ہے یہ رائے نہیں قائم کر سکتے کہ یہ سلطنت سریع الزوال ہے اور وہ زمانہ کچھ دور نہیں ہے جب ہلکو اس ملک سے واپس آنا پڑے؟

دوسری طرف ایسے مسئلہ پر غور کرنے میں عقلمند سے عقلمند انسان غلطی کر سکتا ہے۔ سلطنت ہند کی انتہا شاید اتنی ہی بعید از قیاس ہے جتنی اسکی ابتدا۔ تاریخ میں ایسی کوئی نظیر نہیں ہے۔ اگر ایک دور افتادہ جزیرہ سے ہندوستان کی حکومت ایک ناپائیدار شے نظر آتی ہے تو یہ بالکل قدرتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں ایک وہ دن تھا جب اُسکے وجود کا ہلکو گمان بھی نہیں تھا بہر کیف اگر اسکو زوال ہوتا ہے تو اس زوال کے ثبوت کا جاننا ہمیں لازم ہے۔ جن بے حساب مشکلات کا اسکو مقابلہ کرنا پڑتا ہے اسکا ثبوت البتہ ہم دریافت کر سکتے ہیں لیکن اسکے زوال کے آثار شاید ہی کوئی بتا سکے۔ اور پھر اگر ہم تسلیم کر لیں یا انکار نہ کریں کہ انگلینڈ کو اس سلطنت کی بیدار کردہ مشکلات کا معاوضہ نہیں ملا تو اس اصرار میں کوئی عملی اہمیت نہیں پیدا ہوتی۔ اس طرح کے اقرار اور کسی ایسی عملی تجویز میں (جیسے اس سلطنت کو چھوڑ دینا) بڑا فرق ہے۔

یہ خیال قائم کرنا ممکن ہے کہ اگر انگلینڈ سرے سے کسی سلطنت کی بنیاد نہ ڈالتا اور چین کی طرح ہندوستان کے ساحلون پر بھی محض ایک تاجر کی حیثیت سے رہتا تو اس وقت اسکی حالت بدرجہا بہتر ہوتی۔ مگر وہ لوگ بھی جن کو یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن ہندوستان چھوڑنا ہے اس خیال پر عملی حیثیت سے غور و خوض کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے کام ہیں جنکا نہ کیا جانا اچھا تھا لیکن ہو جانے کے بعد انکا بگاڑنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ ایسا وقت آسکتا ہے جب ہندوستان کو اسکے حال پر چھوڑنا ممکن العمل ہوگا لیکن فی الحال اسپر اسی طرح حکومت کرنی چاہئے گویا ہمکو ہمیشہ کرنا ہے۔ ایسا کیون؟ یہ نہ سمجھو کہ اس میں ہماری ہی غرض ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہماری عزت قومی اس بات کی متقاضی ہے کہ جس ملک کو ہمارے آباد اجداد نے اپنا خون بہا کر حاصل کیا ہو اور جو ہماری قوم کی سپاہیاں بہادری کی عظیم یادگار ہو اسپر قابض رہیں۔ لیکن میرے خیال میں عزت کے تمام ایسے مفہوموں میں درندگی کی بوائی ہے۔ ان مفہوموں کی بناء جیسا میں کہ چکا ہوں، حکومت اور ملکیت کے قدیم اور تروک معنی کو خطا ملطا کر دینے پر ہے ایک لمحہ کے لئے بھی سوائے ہندوستان اور انگلینڈ کی یہودی کے کوئی اور بات نہیں ملحوظ رکھنا چاہئے لیکن چونکہ ہندوستان کا مفاد زیادہ وابستہ ہے اور وہ انگلینڈ سے زیادہ بڑا اور زیادہ غریب بھی ہے لہذا اسکا خیال انگلینڈ سے پہلے کرنا چاہئے۔ انھیں اصول کی بنا پر اور خصوصاً ہندوستان کے مفاد کی رعایت سے ہمارا اسکو چھوڑ دینا فی الحال غیر ممکن ہے۔ اگر صرف ہمارے ذاتی نفع کا سوال ہوتا تو ہم ایسا کر سکتے تھے۔ اگرچہ آج تجارت اس اعلیٰ پیمانہ پر پہنچ گئی ہے اور انگلینڈ نے اپنا کثیر سرمایہ گزشتہ چند سالوں کے اندر ملک میں لگا دیا ہے تاہم اسکا چھوڑ دینا آسان ہی نہیں بلکہ ممکن بھی ہے۔ برخلاف اسکے جب ہم ہندوستان کے مفاد کا خیال کرتے ہیں تو یہ امر قطعی ناممکن نظر آتا ہے ہمارے طرز حکومت پر بہت سے پچرا اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ بعضوں کو کلام ہو سکتا ہے کہ ہماری حکومت یہاں کے باشندوں کے مزاج کے موافق ہے اور اسکے اخراجات بلا ضرورت اور مسرفانہ ہیں۔ اور اسی طرح کے دوسرے اعتراض کئے جاسکتے ہیں۔ اس نامتوازی تجربہ کے انجام کے متعلق ہمیں جائز اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس امر سے انکار کرنا کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد سے جتنی حکومتیں ہندوستان میں قائم ہوئیں ان سے ہماری حکومت اچھی ہے، درست نہ ہوگا۔ اگرچہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہماری حکومت آخر کار نا کام ہوگی لیکن ملک کو کبھی ہم ایسی قابل رحم حالت میں نہیں چھوڑ سکتے جو اس وقت سے جب ہم نے اسکو حاصل کیا کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔ ایک متوسط درجہ کی حکومت بالکل نونے سے تو بہتر ہی ہے۔ ایک ظالم اور مستبد حکومت کا بھی یکایک ہٹ جانا خطرناک تجربہ ہے۔ بلاشبہ ایسے ممالک ہیں جو اس آزمائش میں بغیر فتنہ و فساد میں مبتلا ہوئے ثابت قدم رہ سکتے ہیں۔ ان ممالک سے جو غیر گنجان آباد ہیں یا جنکے باشندے عرصہ دراز سے آزادی عمل کے عادی ہیں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ جلد از جلد حسب ضرورت کوئی نظام حکومت ترتیب دے لیں گے۔ لیکن ہندوستان کی

بابۃ ایسی تجویز کا خیال کرنا کسی قدر مضحکہ خیز ہے۔ جس وقت ہندوستان میں ہمارا قبضہ شروع ہوا وہ ایسے خوفناک فتنہ و فساد کی حالت میں تھا کہ شاید یورپ کو اپنی ساری زندگی میں ایسا تجربہ نہ ہوا ہوگا۔ جو یہی سہی حکومت باقی تھی وہ بھی جابر تھی اور عموماً ایسے جنگ و جدال پسندوں کے ہاتھ میں تھی جنکا سہارا ایسی فوج پر تھا جس میں آوارہ گرد اور لیٹے بھرے تھے جنکا پیشہ غارتگری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت مرہٹوں نے ہندوستان کے بڑے حصہ کو گھیر لیا تھا، دہلی اور کلکتہ دونوں اُنکے خوف سے کانپ رہے تھے حالانکہ انکا مرکز پونہ تھا۔ لیکن یہ قوت بھی غارتگری کی ایک باقاعدہ تحریک تھی۔ ادھر شمال میں نادر شاہ اپنی مہموں میں تیمور لنگ کی ہمسری دکھا رہا تھا لیکن یہ عذر کیا جاسکتا ہے کہ یہ بدامنی صرف چند روزہ تھی اور سلطنت مغلیہ کی تباہی سے پیدا ہوئی تھی۔ تاہم اس سے اس قدر ضرورت ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان ایسا ملک نہیں ہے جو حکومت کی علیحدگی برداشت کر سکے۔ کیا سلطنت مغلیہ کے متعلق ہمارا قیاس مبالغہ آمیز نہیں ہے؟ اسکا عروج بہت قلیل عرصہ تک رہا۔ دکن میں اسکو حقیقی استقامت کبھی نہیں ہوئی جس طرح کی انارکزم سے کلا یو اور مشنگز کو ہندوستان میں سابقہ پڑا وہ اپنی نوعیت میں ایسی نادر نہیں تھی جیسی بظاہر معلوم ہوتی ہے۔ البتہ اُس وقت اتبری اور بدامنی اتنی سخت تھی کہ اسکی نظیر نہیں ملتی محمود کے زمانہ سے برابر ہندوستان ایک قسم کی بد نظمی میں مبتلا چلا آتا تھا البتہ اکبر اور شاہجہان کے عہد میں اسکا شمالی حصہ چندے اس بلا سے مامون رہا۔

الغرض ہندوستان ان تمام ممالک سے جن میں مستحکم سلطنت کے ارتقا کی قابلیت ہے زیادہ ناقابل ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ رہی سہی قابلیت اسکے اندر تھی اسکو ہماری حکومت نے کم کر دیا ہے کیونکہ ہمارے تسلط نے ان طبقوں کو جنہیں کچھ بھی حکومت کی استعداد اور عادت تھی یقیناً پست کر دیا ہے۔ قدیم شاہی نسل امراء شرفاء کے طبقہ نے خصوصاً مسلمانوں نے جو سلطنت مغلیہ کے عمال حکومت میں جزو غالب تھے ہماری حکومت میں سب سے زیادہ نقصان برداشت کیا اور سب سے کم نفع اٹھایا۔ اور یہ بربادی اور تباہی اُن لوگوں کے لئے جو ہماری سلطنت کا تاریک پہلو دیکھتے ہیں حد درجہ غم انگیز ہے لیکن کیا یہ اس امر کی دوسری دلیل نہیں ہے کہ ہماری حکومت کو ابھی قائم رہنا چاہئے۔ اب تم ملک کے اس طول و عرض کو دیکھو اور سوچو کہ ہم نے برہمنی روایات کی جگہ کس طرح مغربی سائنس رائج کر کے روشن دماغ طبقہ کے اخلاقی اور مذہبی خیالات کو اندر رکھ کر کھلا کر دیا ہے جب تم ان پہلوں پر غور کرو گے تو تمکو معلوم ہو جائیگا کہ ایسے ملک سے جو صرف ہماری حکومت کا محتاج ہے اور بجز ہمارے کسی دوسرے کی حکومت کا اہل نہیں، اپنی حکومت کا سایہ اٹھا لینا سخت ناقابل عفو جرم ہوگا۔ اور بہت اندیشہ ہے کہ اسکی وجہ سے ناقابل قیاس آفات و ابتلا رونما ہو جائیں۔

یہ ہے خاکہ، مسئلہ ہند، کا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ کیونکر پیدا ہوا؟ ہمارے قبضہ میں اتنی عظیم الشان سلطنت کس طرح آئی؟۔

(باقی آئندہ)

عبدالقیوم رسا

بازگشت

(۱)

ادریس کو صرف یہ علم نہ تھا کہ محبت میں اس کے ساتھ دغا کی لگتی اور رابعہ سے اس کو محروم ہونا پڑا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کو رابعہ کے ساتھ شدید الفت تھی اور رابعہ کے حرکات و سکنات سے بھی پایا جاتا تھا کہ وہ ادریس کو چاہتی ہے۔ ادریس کو یقین تھا کہ وہ اس کے سوا کسی غیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گی۔ اس کو رابعہ کی محبت پر اعتماد تھا۔ رابعہ نے طوطے کی طرح اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور رعبہ کے ساتھ کچھ ایسا جو ہوئی کہ ادریس اک بھولا ہوا خواب ہو کر رہ گیا۔ اس سے ادریس کو صدمہ ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ لیکن شاید وہ اس صدمہ کو برداشت کر لیا اگر سب سے بڑا دھکا اس کو یہ لگا تھا کہ رابعہ جس کو وہ محبت اور معصومیت کا مجسمہ سمجھتا تھا، آزمائش سے اس طرح مغلوب ہو گئی اور اپنی انسانیت کا بھی یاس نہ کیا۔ ادریس عورت کی ہر کمزوری اس کے ہر عیب کو معاف کرنے کے لئے تیار تھا۔ لیکن تردید محبت عورت کا وہ جرم تھا جس کی سزا میں جو عقوبت بھی تجویز کی جائے وہ کم تھی۔ آج اس نے سمجھ لیا کہ محبت اور معصومیت دنیا سے اٹھ گئی ہے۔ اس لئے کہ جب رابعہ میں یہ خوبیاں نہیں تو دنیا کی کسی عورت میں نہیں ہو سکتیں۔ رابعہ ایسی بے اعتبار نگلی تو دنیا کی ہر عورت بے اعتبار ہوگی یہ بھی ادریس کی منطق جس نے اس کو اس نتیجہ پر پہنچایا تھا کہ عورت سے وفا و محبت کی امید رکھنا اپنی غلطی ہے۔ عورت صرف گناہ کے لئے پیدا ہوئی ہے وہ محض ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ قدرت اپنا کام پورا کرتی ہے اور انسان کو آسانی سے آزمائش و ابتلا میں گرفتار کرتی ہے۔ عورت کو بھی اب وہ ”پردہ زنگاری“ کے ”معتشوق“ کا ایک جالستان غمزہ سمجھنے لگا تھا۔ ادریس ایک نہایت غریب گھرانے کا لڑکا تھا۔ سات پشت سے محتاجی و ناداری اس کے گھر میں چلی آتی تھی اس کے باپ نے اپنے قوت بازو سے کما کر موضع راجہ میں چار آنہ کا حصہ خریدا تھا، اس کے علاوہ آٹھ دس بیگہ کھیت آبائی تھے۔ یہ کھیت اس جاگیر کی یادگار تھے جو کسی زمانے میں ادریس کے مورث اعلیٰ کو معافی ملی تھی اور جو غدر کے ایام میں یا کچھ دنوں پہلے زمانے کی چند کروٹوں میں خاندان کے قبضہ سے نکل گئی تھی۔

ادریس کا باپ اس کم بضاعتی میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کی پرورش کر رہا تھا اور ادریس کو انگریزی تعلیم دلارہا تھا۔ تینوں لڑکیاں زاہدہ۔ شاہدہ۔ اور غاصیہ ادریس سے بڑی تھیں۔ ادریس کی عمر چودہ سال کی تھی اور وہ نویں درجہ میں پڑھتا تھا جبکہ تینوں بہنوں کی شادی ہو گئی اور وہ اپنی اپنی سسرال گئیں۔ باپ کے سر سے بوجھ ہلکا ہو گیا مگر اب دوسری فکر دانگ تھی کہ جو کچھ زمینداری ہے اس کا کافی حصہ دختریں میں نکل جائے گا۔ اور ادریس کی وہی حالت ہوگی جو ابتدا میں اس کے باپ کی تھی۔

اسی لئے باپ اس موصن کے ساتھ اپنا پیٹ کاٹ کر ادریس کو پڑھا رہا تھا کہ آگے چلکر اپنا ذریعہ معاش آپ نکال سکے۔ لیکن اس کو بیٹے کا وہ خوش آئند مستقبل دیکھنے کی نوبت نہ آئی۔ جس سال ادریس نے انٹرنیس کا امتحان دیا۔ باپ ہیضہ کا شکار ہو گیا اس مصیبت پر سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ادریس کو یہ دوسرا صدمہ ہوا۔ رابعہ اسکی رشتہ کی بہن ہوتی تھی اس کے ماں باپ امیر اور فکر معاش سے آزاد تھے۔ ادریس بچپن سے رابعہ کا دلدادہ تھا۔ رابعہ بچپن سے ادریس کے ساتھ منسوب تھی۔ رابعہ کے دادا کی وصیت تھی کہ وہ ادریس کے ساتھ بیاہی جائے وہ چاہتے تھے کہ ان کی دولت خاندان کے اور لوگوں میں بھی تقسیم ہو جائے اور ادریس سے ان کو خاص محبت تھی اس لئے کہ لڑکا ہونا اور سعادتمند تھا

ادریس گورکھپور میں پڑھتا تھا۔ الٹ۔ لے کا پہلا سال تھا۔ امتحان کے دن قریب تھے۔ ادریس آج تک درجہ میں دویم نہ ہوا تھا۔ کالج کی ابتدائی زندگی تھی طلبہ میں حریفانہ چشمک بڑھتی ہوئی تھی، ہر شخص اول آنے کی فکر میں تھا، ادریس بھی خاموشی اور محویت کے ساتھ محنت کر رہا تھا اسکو وظیفہ کی بھی فکر تھی۔ انٹرنیس کا وظیفہ اسکول رہا تھا اور اگر یہ مقامی وظیفہ بھی مل گیا تو ماں کو بارے کیلکنت سبکدوش کر دیگا، ادریس امروز فردا کی نیرنگیوں سے بے خبر امتحان کی تیاری میں مشغول تھا کہ اسکی ممتاز کا خط ملا جس نے اسے سکون و اطمینان کی دنیا کو آنا فانا برہ باد کر کے رکھ دیا۔

روٹ، رابعہ کا چچا زاد بھائی تھا اس کا باپ کانپور میں تجارت کرتا تھا۔ اور بڑا آدمی سمجھا جاتا وہ زیادہ تر پردیس ہی میں رہا کرتا تھا گھر بہت کم آتا تھا۔ روٹ کو اس نے بڑے ارمانوں کے ساتھ پڑھایا تھا۔ روٹ نے بی۔ اے کر لیا تھا اور سرکاری ملازمت پاگیا تھا۔ ملازمت میں اس کا جی نہ لگا تو اس کو شوق ہوا کہ اپنی زمینداری کو چل کر سنبھالے اس غرض سے اسے چھ ماہ کی رخصت ملی اور رام نگر میں اپنے چچا کے یہاں آکر ٹھہرا۔ رابعہ کے ساتھ دن رات کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ نتیجہ جو ہوا وہ خلاف توقع ہرگز نہ تھا۔ روٹ نے رابعہ کو اپنا گرویدہ بنالیا اور تین چار مہینوں میں تو یہ عالم تھا کہ رابعہ اگر کبھی تمام دن روٹ کو نہ دیکھتی تو ایسا محسوس کرتی کہ اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ رابعہ کے والدین اس کا یہ حال دیکھ دیکھ کر خوش تھے اس لئے کہ وہ روٹ کو رابعہ کے لئے بہترین شوہر سمجھتے تھے، ادریس کا خیال رفتہ رفتہ سب کے ذہن سے نکل گیا۔ رابعہ خود بھی اس کو چند مہینوں میں خاطر انداز کر چکی تھی۔

ممتاز، ادریس اور رابعہ دونوں کا رشتہ دار تھا۔ کئی پشت سے اس کا گھرانہ فلاکت و تنگدستی میں بسر کرنے کا خوگر تھا، ادریس اور ممتاز بچپن کے ساتھی تھے، ممتاز کے والدین ایسے نادار تھے کہ دو وقت کی روٹیاں بھی مشکل سے مہیا کر سکتے تھے لیکن رابعہ کے دادا بڑے کنبہ پرور تھے انہوں نے ادریس اور ممتاز دونوں کو فارسی کی تعلیم گھر پر دلوائی دونوں کو انگریزی پڑھنے کا جوار مان تھا۔ اکثر جب وہ تنہائی میں اکٹھا ہوتے تو اسی موضوع پر بڑے دلولوں کے ساتھ گفتگو کیا کرتے تھے۔ دونوں متصمم ارادہ کئے ہوئے تھے کہ گورکھپور میں چلکر انگریزی اسکول میں نام لکھائیں گے اور جہاں تک ان کے بس میں ہوگا تعلیم کا سلسلہ جاری رکھیں گے مگر زمانہ کی رفتار کچھ عجیب بے معنی اور بے قاعدہ ہوتی ہے وہ سب کو یکساں موقع نہیں دیتا ادریس کی حسرت پوری ہو گئی لیکن

ممتاز بچارہ کی حسرت دل کی دل ہی میں رہی۔ رابعہ کے دادا اگر زندہ ہوتے، تو بہت ممکن تھا اس کا بھی حوصلہ پورا ہو جاتا۔ لیکن اس نیک نسا اور خدا ترس بزرگ کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو کسی دوسرے کے دل کی لگی کو سمجھاتا اور اس کے ساتھ ہمدردی کرتا اور ممتاز کے ماں باپ کی قدرت سے یہ باہر تھا کہ وہ بیٹے کو بڑھاتے لکھاتے۔

ممتاز، مقدر کے آگے سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ اہل قضا و قدر کی بے نیازی کا اگر کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ تسلیم ہے ممتاز جانتا تھا کہ ہم پر آپ پر اختیار کا دروازہ جب کھلا نہیں ہے تو پیشانی پر بل ڈالنا ایک فعل عبث ہے۔ سوا اسکے کہ جو کچھ آپ کو دیا گیا ہے اس پر صبر و شکر کر کے بیٹھ رہتے۔ اور کر ہی کیا سکتے ہیں۔ رہ گیا یہ کہ اس کے بعد اپنی قسمت کو کوس کوس کر اپنی زندگی کو دوزخ بنایے یا ہر بات میں ایک راحت کا پہلو نکال کر دوزخ کو بھی جنت سمجھے سو ممتاز کے خیال میں باہل اپنی اپنی توفیق کی بات تھی، یہاں اس سے بحث نہیں کہ ممتاز کا خیال صحیح تھا یا غلط۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ وہ اپنی تلخیوں سے لذت حاصل کر رہا تھا۔

ادریس کی طرح ممتاز بھی بچپن سے رابعہ کا دلدادہ تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ رابعہ کی آرزو کرتا زمین پر رہ کر چاند کی آرزو کرنا ہے۔ ادریس اور ممتاز ایک دوسرے کے راز سے واقف تھے ادریس میں لگن ہے کہ جذبہ رقابت کا کوئی شائبہ رہا ہو۔ مگر ممتاز شوق کی اس منزل تک پہنچ گیا تھا جہاں ”عداوتِ اختیار“ تو ایک طرف دل میں ”ہوس یار“ تک باقی نہیں رہتی جس دھن کے ساتھ ممتاز رابعہ کو چاہنے کا دعویٰ کر سکتا تھا، شاید ادریس نہیں کر سکتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے دل میں یہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ:-

”مرا ازاں چہ کہ شیریں بے است در کشمیر مرا ازاں چہ کہ نوشیں بے است در نوشاد“

ممتاز طبعاً صوفی منش آدمی تھا اس کے ضمیر میں وہ جذبات موجود تھے جو آخر میں انسان کو صوفی یا سیراگی بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے رابعہ سے ہاتھ اٹھالینا اس کے لئے کوئی بڑی بات نہ تھی اس کے سکون نفس کے لئے یہ خیال کافی تھا کہ وہ کسی سے محبت کرتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ رابعہ کی شادی ادریس سے ہوگی اور وہ خوش تھا کیونکہ یہ بھی جانتا تھا کہ رابعہ کو ادریس سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا۔

ممتاز موضع یوسف پور میں رہتا تھا جو رام نگر سے تقریباً آدھی میل اتر پورب کے کونے پر ہے یہ دونوں گاؤں ضلع بستی میں مگر کے قریب دیانے آتی ہے کچھ دور چھم واقع ہیں اور گرد و نواح کی آبادیوں میں اس لئے ممتاز سمجھے جاتے ہیں کہ یہاں زیادہ تر شرفاکی بستی ہے۔ ممتاز کے باپ کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ اس نے کچھ دنوں تک تو ان کھیتوں پر زندگی بسر کی جنکو ایک کم مایہ زمیندار سے لگان پر اس کے باپ نے لے رکھا تھا۔ مگر پھر یہ بھی سہارا نہیں رہا۔ اس ملک میں زمین زمیندار کی ازلی میراث ہوتی ہے۔ فاقہ کرنے والے کسان ان کے دست کرم کے محتاج ہوتے ہیں۔ انہوں نے جب چاہا کاشتکار سے کھیت اس طرح نکال لیا جس طرح چور سے مال مسروقہ۔ ممتاز کے پاس بھی وہ کھیت رہنے نہ پائے۔ زمیندار نے نہ جانے

کس مصلحت سے اسکو ممتاز کے قبضہ سے نکال لیا۔ ممتاز نے بڑی بڑی مشکل سے ایک چھوٹی سی پونجی جھیا کی اور خلیل آباد میں کپڑے کی ایک کان کھول کر توکل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

خلیل آباد بستی کی ایک تحصیل ہے اور ہرگز سے کوئی چار، پانچ میل کچھ ہے۔ ممتاز دن کو خلیل آباد میں رہتا اور شام کو دکان بڑھا کر گھومتا پھرتا ہوا سب سے پہلے رام نگر پہنچتا تھا اور ایک نظر رابعہ کو دیکھتا ہوا اپنے مکان کو چلا آتا تھا۔ رابعہ اسکی بے غرض محبت سے واقف تھی مگر کبھی اس نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا اور نہ اس کے نزدیک ممتاز کوئی قابل اعتنا ہستی تھا وہ بس کبھی بھی ممتاز سے دلربا نہ انداز کے ساتھ مسکرا کر دو چار باتیں کر لیتا ممتاز کی سیار مزدیوں کا کافی صلہ سمجھتی تھی۔

ممتاز زندگی کی ماہیت سے آگاہ تھا اسکو معلوم تھا کہ ”اسفل السافلین“ میں کرب و اہم بہ مقابلہ راحت و اہنسا ط کے کہیں زیادہ ہے مگر وہ ان لوگوں میں سے تھا جو خدا کو ”حکیم و بصیر“ مانتے ہیں۔ اسکا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کو جس چیز نے انسان بنایا ہے وہ اس کا دکھا ہوا دل ہے ورنہ آج وہ بھی زیادہ سے زیادہ کر دیوں کا ہم بزم ہوتا اور اشرف المخلوقات کہے جانے کا کسی طرح مستحق نہ ہوتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہماری یہ زندگی محنت و تباہی کی زندگی ہے لیکن ہماری روحانی تحسین و تکمیل کے لئے یہ ایک لازمی چیز ہے سنانی نے ارتقاء انسانی کے لئے یہ شرط بتائی ہے

”وَرَدَّ بَابِدْ صَبْرٌ سَوْز و مَرَدَّ بَابِدْ گامزن“

ممتاز کا فلسفہ زندگی بھی یہی تھا وہ زمانہ کی تلخیوں اور زمین و آسمان کی ستم ایجادوں سے بے خبر تو نہیں مگر بے پروا ضرور تھا۔ اس کو ”نفس مطمئنہ“ جیسی دولت نصیب تھی اس کے لئے سب سے بڑی راحت رابعہ کی محبت تھی جس کو وہ بچائے خود ایک نصب العین سمجھے ہوئے تھا۔

لیکن جب اسکو معلوم ہوا کہ رابعہ نے اپنے جذبات محبت اور تیس سے رُوف کی طرف منتقل کر دیئے ہیں اور اسکے والدین اب سال کے اندر رُوف کو اسکا رفیق زندگی بنانے والے ہیں تو ممتاز کے دل کو غیر معمولی دھکا لگا۔ دنیا کی یہ سفلہ پروری برداشت کے قابل نہ تھی۔ اسکا دل دکھ گیا وہ ادریس کو رابعہ کے لئے بہترین شوہر سمجھتا تھا۔ ادریس کی اس سے بڑھ کر حق تلفی اور کیا ہو سکتی تھی۔ ممتاز نہ جانے کیوں رُوف سے پہلے ہی نظریں نفرت کرنے لگا تھا۔ رُوف کے تیور سے اسکی طبیعت میں ایک غیر واضح بد مزگی سی پیدا ہو گئی تھی جو کبھی دور نہیں ہوتی۔ جس وقت ممتاز نے رابعہ اور رُوف کو پہلی بار اکٹھا دیکھا اسکا دل ایک نامعلوم اندیشہ سے دھڑکنے لگا، اور یہ دھڑکن قائم رہ گئی۔ رُوف کے آتے ہی ممتاز نے رابعہ سے ملنا کم کر دیا تھا اور اب جبکہ یہ بات گرد و نواح میں مشہور ہو گئی کہ عنقریب رابعہ کی شادی رُوف سے ہونے والی ہے تو اس نے رام نگر کا آنا جانا بھی بند کر دیا اور ادریس کو مفصل حالات لکھ بھیجے۔

ادریس افتاد طبیعت کے لحاظ سے ممتاز کا مد مقابل تھا۔ بچپن سے وہ زندگی کو ایک روگ سمجھتا تھا جن ناہمواریوں سے

اسکو گزنا پڑ رہا تھا انکو وہ کسی رحیم و کریم کار ساز کی عنایت سمجھنے سے طبعاً معذور تھا۔ دنیا کی کسی چیز میں اسکو کوئی روشن سیلو نظر نہ آتا تھا۔ رابعہ اور رابعہ کی محبت ہی ایک چیز تھی جو کبھی کبھی اسکو دل میں یہ خیال پیدا کر دیتی تھی کہ ممکن ہے اس دنیاوی زندگی کا انجام بخیر ہو مگر اب تو وہ ایک ایسی تاریک خلا میں پھینک دیا گیا جہاں اس کے سہارے کے لئے ایک تنکا بھی نہ تھا۔ ممتاز کے خط کے ساتھ اس کی ماں نے بھی ایک تحریر بھیجی تھی جس میں بیٹے کی تسلی و تسفی کے لئے بچاری نے اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا مگر ادریس کی تسلی آسان نہ تھی۔ کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا کہ خود اپنے کو میں پہچانتا۔ گرد و پیش جو ہر صورت مانوس تھے اسکو غیر مانوس نظر آ رہے تھے اگر اس میں ارادہ کی قوت زبردست نہ ہوتی تو شاید بہت جلد ڈاکٹر اسکو فتور و ماغ کی سند دیدیتے وہ نہ جانے کیسی کیسی امنگوں کو اپنے دل میں پرورش دے رہا تھا، وہ یہ سوچ سوچ کر رگوں میں اک روح افزا گرمی محسوس کر رہا تھا کہ جب رابعہ اسکی اپنی ہو جائے گی تو وہ اس زندگی کو جو ”مرد کے آتشکدہ سے کسی طرح کم نہیں“ ابراہیم کا گلزار“ بنانے کی کوشش کرے گا اور اسکو قوی امید تھی کہ اس کوشش میں کامیاب ہوگا، مگر امیدیں پوری کب ہوتی ہیں۔ قدرت کا کارخانہ ہی کچھ نرالا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری اندھیری رات روشن ہو جائے اور ہمارا دن بھی سیاہ کر دیا جاتا ہے۔ ہم اپنی تمام قوت ”باراں کی آرزو“ میں صرف کر دیتے ہیں اور آخر کار ہمارے لئے آگ برساتی جاتی ہے۔ حسرتوں کا خون کرنا قدرت کا کھیل ہے اگر کبھی کسی کی کوئی حسرت پوری ہو جائے تو اسکو صرف ایک حسن اتفاق یا قدرت کی... فرد گزاشت سمجھنا چاہئے۔ قطرہ بالعموم موتی نہیں ہوتا اس تمنا میں نہ جانے کتنے قطروں کو ”کام نہنگ“ کی نظر ہو جانا پڑتا ہے۔

ادریس دنیا میں صرف دو ہستیوں کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک تو رابعہ تھی اور دوسری اپنی ماں۔ رابعہ سے دفعۃً اسکو اپنا دل ہٹانا پڑا تو ماں کے ساتھ اسکی محبت دگنی ہو گئی۔ یہ ماں ہی کی محبت تھی جس نے اسکو ایک خطرناک لمحہ سے بچالیا ورنہ اس کے اعصاب کو ایسا دھکا لگا تھا کہ شاید اب آگے پڑھنا اس کے بس کی بات نہ ہوتی لیکن اس خیال نے کہ اس کے ماں کی آئندہ خوشیاں اسی کے دم سے ہیں اس کو اپنے کام میں ثابت قدم رکھا۔ کچھ دنوں میں اس نے اپنے منتشر حواس کو جمع کیا اور اب پہلے سے کہیں زیادہ انہماک کیساتھ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے فرصت کے اوقات کو بھی اس نے کام میں صرف کرنا شروع کیا۔ وہ اسکو لکھتے تین چار لٹروں کو پڑھانے لگا تھا اور اب ماں سے ایک پیسہ بھی اپنے خرچ کے لئے نہیں مانگتا تھا بلکہ کبھی کبھی کچھ روپیہ اپنی کمائی سے اسکو بھیج دیا کرتا تھا، یہ سب ادریس کی غیر معمولی قوت ارادی کا نتیجہ تھا۔ اس میں ایک تغیر البتہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اسکو خوش پوشی کا شوق تھا وہ اپنی بے باگی میں جیسے صاف ستھرے کپڑے پہنتا تھا بڑے بڑے امیر زادوں کو نصیب نہ تھے ادریس کا سلیقہ ضرب المثل تھا مگر اب وہ اسکی طرف سے بھی غافل تھا اور زیادہ تر موٹے کپڑے پہننے لگا تھا دفعۃً یہ انقلاب ادریس کے ہم جماعتوں کی سمجھ میں نہ آیا۔

پہلے سال ایف۔ اے کے امتحان میں ادریس بڑی کوششوں کے بعد ممتاز رہا۔ اسکو مقامی وظیفہ مل گیا اور اس کا علمی حوصلہ بڑھ گیا۔ گرمی کی تعطیل میں وہ صرف چند دنوں کے لئے اپنی ماں کے پاس آکر رہا اور پھر اسکو دلاسارے کر چلا گیا۔

رام نگر کی بدلی ہوئی فضا سے ہر قدر جلد وہ موانست نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ رابعہ کا قرب تو ایک طرف اور تیس کے لئے اب ہر وہ چیز سوہان روح تھی جو اسکو رابعہ کی یاد دلادے اس لئے اب وہ کم از کم رام نگر میں رہنے کی تاب نہ لاسکتا تھا، اس کے علاوہ جن لوگوں کو وہ پڑھاتا تھا ان کے لئے چھٹیوں میں بھی اسکا گورکھپور رہنا ضروری تھا۔ لہذا وہ ماں کو سمجھا بھجا کر چلا گیا۔ غریب سکینہ ان ماؤں میں سے تھی جو اولاد کی فلاح و بہبود کے لئے جان سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ اسکو اسکا صدمہ تھا کہ بیٹا سال بھر کی جدائی کے بعد بھی دو ماہ کے لئے اطمینان کے ساتھ اس کے پاس نہیں رہ سکتا مگر وہ خوب جانتی تھی کہ اور تیس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ اس نے پردہ ہی پردہ میں اور تیس کی دلجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور جب یہ دیکھا کہ بیٹے کے لئے رام نگر سے دوری رہنا بہتر ہے تو ہنسی خوشی سے اس پر بھی راضی ہو گئی۔

ایف۔ اے کا دوسرا سال تھا، جاڑوں کا موسم تھا۔ رابعہ کی شادی کے دن قریب تھے۔ اور تیس کے نام بھی دعوتی رقعہ آیا تھا اور تیس پر اس سے زیادہ ظلم ممکن نہ تھا اس کے دل کے ایک ایک ریشہ سے پسین اٹھ رہی تھیں مگر اس نے بڑے ضبط سے کام لیا انگریزوں میں ڈال کر خاموش ہو رہا۔ وہ رابعہ کی شادی میں شریک نہیں ہوا۔ رابعہ اب رابعہ نہ تھی اب وہ رؤف کی بیوی تھی پہلی رابعہ کو اور تیس خواب کی رابعہ سمجھ کر بھول گیا تھا۔

(۴۷)

پانچ برس گذر گئے رابعہ اور رؤف کی زندگی کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ خوشگوار تھی اگرچہ رؤف نے اس عرصہ میں کچھ جوہر ایسے بکالے جس کی لوگوں کو امید نہ تھی۔ اس نے ملازمت ترک کر دی تھی اور اب اپنی جائیداد کی دیکھ بھال میں مصروف تھا۔ اسکی جائیداد رابعہ کی جائیداد سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ صاحبِ نقد تھا اور اس حیثیت سے بھی ملازمت کا محتاج نہ تھا پھر کیا وجہ کہ وہ گھر پر عیش و بے فکری سے زندگی بسر نہ کرے، اس نے اپنی ماں اور چھوٹی بہن کو بھی گاؤں پر بلالیا اور پرانے مکان کو از سر نو شہری طرز پر تعمیر کرا کے وہیں سکونت اختیار کر لی اس کا بس ہوتا تو باپ کو بھی بلالیتا مگر باپ نے کانپور چھوڑنا پسند نہیں کیا۔ رؤف فطرتاً و باش تھا۔ عیاشی اور لذت پرستی اس کو دراشت میں ملی تھی۔ اسکی محبت بوا اسوی تھی۔ رابعہ کے ساتھ دو سال تو اس نے بڑے انماک میں گزاریے اس کے بعد اس نے اپنے خردوش نفسانیت کو آسودہ کرنے کے لئے نت نئی دلچسپیاں نکالنا شروع کیں لیکن پھر بھی رابعہ کے ساتھ اسکا برتاؤ ایسا نہ تھا جو کسی طرح قابلِ ملامت سمجھا جاتا۔ البتہ اب وہ اسکو ایک ہندوستانی بی بی سے زیادہ قابلِ قدر نہیں سمجھتا تھا۔

رؤف کی روش لوگوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ قریب و دور کی بہو بیٹیوں کو بکانا اور ان کو مبتلا کر کے چھوڑ دینا دن رات کا اسکا مشغلہ ہو گیا تھا۔ گھر والوں نے مجبوراً اس کو ریاست کی ایک شان سمجھ لیا مگر گاؤں والے رؤف کو پورا شیطان سمجھتے تھے اگر اس کے پاس اتنی دولت نہ ہوتی جو ہر موقع پر اسکے کام آتی تھی تو شاید آج اسکا اس جواریں ہندو شوار کر دیا جاتا۔ فاقہ مست کسان لکشمی کے خلاف کوئی سست سے سست تدبیر اختیار نہ کر سکتے تھے۔ ناچار سب دیکھتے تھے اور رؤف کی جان کو کوس ک

چپ رہ جاتے تھے۔

رکون نے چاروں طرف اپنا سکہ جانے کی ایک صورت اور بھی نکالی رکھی تھی وہ سود پر روپیہ تقسیم کرتا تھا زمین پھاڑ کر سیٹ پانے والے کسان اور چھوٹی پونجی والے زمیندار اس کے قرضدار رہتے تھے اور رکون ان سے جو چاہتا تھا روپیہ کے بل پر کر لیتا تھا بظاہر وہ ان ناداروں کی روپیہ سے مدد کرتا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ بیچارہ کا خون چوس رہا تھا۔ سرمایہ داری کا روگ یوں تو ساری دنیا میں پھیل چکا ہے مگر ہندوستان اس کے ہاتھوں بری طرح مٹ رہا ہے اور سرمایہ داری و زمینداری نے ملکر کاشتکاروں کے پاس سوا جسم اور سانس کے اور کچھ نہیں چھوڑا ہے اس ملک کی آبادی میں کسانوں کی تعداد غیر متناسب طور پر زیادہ ہے ہندوستان کی فلاح و بہبود دراصل انہیں ”غم زدوں“ کی فلاح و بہبود پر موقوف ہے مگر شامت ہو تو ایسی ہو کہ آج طرح طرح کی اقتصادی اور سیاسی شورشیں ملک میں پھیل رہی ہیں مگر ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو اس طرف اپنی توجہ مبذول کرے اور خلوص نیت کے ساتھ کانوں کی پست اور گندی زندگی کو ابھارنے کی کوشش کرے۔

(۵)

اگن کا مہینہ تھا۔ سینچر کی شام تھی۔ ممتاز آج خلیل آباد سے سویرے لوٹ آیا تھا۔ ہاتھ پاؤں دھو کر اور ماں نے جو کچھ روکھا سو کھا سامنے رکھ دیا اس کو کھا کر حسب معمول سیر کے لئے نکل گیا اس کا روزانہ دستور یہی تھا صبح شام وہ ٹہلنے ضرور نکلتا تھا اور دور کا چکر لگا آیا کرتا تھا۔ شام کے وقت تو وہ بڑی دیر تک گھر سے غائب رہتا تھا۔ زیادہ تر وہ پریتیا کے جنگل یا اس کے نواح میں گشت کیا کرتا تھا۔ آبادی سے دور ویرانوں میں اس کے لئے دھپ کا سامان زیادہ تھا۔ پریتیا کا جنگل جو قرب دجوار میں مشہور ہے آج کے کنارے واقع ہے اور رام نگر اور یوسف پور کی سرحد سے لیکر چاروں طرف ڈیڑھ کوس کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے جنگل بے انتہا گھنا ہے لیکن اس میں بڑے درخت کم ہیں زیادہ تر ببول اور ڈھاک کے درخت ہیں۔ رات کو اس جنگل سے جو گذرتا ہے بڑا دلیر سمجھا جاتا ہے اس لئے کہ درندوں اور سانپ بچھوؤں کے علاوہ یہاں ڈاکوؤں کا بھی ڈیرا رہتا ہے اور جاہل و غیر تمدن کسانوں کا خیال ہے کہ پریتیا بھوت پریت کا بھی اکھاڑا ہے۔ چنانچہ پریتیا اسے اسی نسبت سے کہتے ہیں۔ ممتاز کو جو لوگ نہیں جانتے تھے وہ حیرت کرتے تھے کہ وہ اتنی رات تک جنگل میں صبح و سالم کیسے بھر کرتا ہے مگر جو لوگ جانتے تھے وہ اس کو صاحب کرامات سمجھتے تھے وہ اللہ والا مشہور تھا۔ اکثر لوگ اس کے مرید تھے۔ اور دعا تعویذ کے لئے اس کے پاس آتے تھے وہ بھی انکو مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا اور اپنی بندگی اور بیچاریگی کا دل میں محضوع و خشوع کے ساتھ اعتراف کر کے ان کے لئے دعا کر دیا کرتا تھا یا تعویذ لکھ دیا کرتا تھا۔ یوں تو اس جنگل کو دیکھ کر ہمیشہ ممتاز کے دل میں ایک جلیل القدر قوت کا احساس ہونے لگتا تھا لیکن جاڑے کے موسم میں اس کا یہ احساس تیز ہو جاتا تھا جبکہ اس جنگل کا جلال پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا تھا۔ آج کربے طرح گر رہی تھی۔ زمین اور آسمان مل گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ قدسیوں اور خانیوں میں کچھ مشوے ہوئے ہیں۔ جنگل کا ایک ایک درخت اور درخت کا ایک ایک پتہ ذی روح معلوم ہوتا تھا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ آبادیوں میں ابھی دھوپ تھی لیکن پریتیا، تیرقدار ہو رہا تھا، اگر کوئی بہ یک وقت پریتیا کا قریب کی بستیوں سے مقابلہ کرتا تو اسکو ماننا پڑتا کہ اگر یہ بستیاں اس دنیا کی چیزیں ہیں تو یہ جنگل کسی دوسری دنیا کی چیز ہے۔ دن ابھی باقی تھا مگر لکڑہائے اپنے اپنے بوجھ سنبھال رہے تھے کیونکہ جنگل میں ایک گھنٹہ پہلے ہی رات ہو گئی تھی۔

پریتیا کی سیر کا مناسب وقت یہی ہے جبکہ ساری دنیا دھیرے دھیرے خواب میں محو ہونے لگتی ہے اور جنگل کی روہیں بیدار ہونے لگتی ہیں ہر طرف ایک حرکت ایک دوا دوش ہونے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پتا پتا کسی اہم کام میں مصروف تھے۔ ایسے وقت پریتیا کے ”رموز مملکت“ میں دخل در معقولات کرنا یا ممتاز جیسے از خود رفتہ لوگوں کا کام تھا، پاچور اور ڈاکوؤں کا۔

پریتیا میں ایک سرے سے دوسرے تک نالوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ یہ نالے آبی سے نکلے ہیں جو رات میں بھر جاتے ہیں اور جنگل کے سماں کو اور بھی بھیا تک بنادیتے ہیں لیکن چارڑوں میں ان میں پانی کم رہ جاتا ہے۔ ممتاز اپنے عھلے موٹسی کے بل پر نالوں کو پھاندتا ہوا پریتیا کے شمالی کنارے تک پہنچ گیا، رات ہو گئی تھی مگر گھر پلٹنے سے ابھی اسکی ”مشت پرست“ طبیعت اسکو روک رہی تھی۔

ممتاز نے جنگل کے آخری حد تک پہنچ کر پلٹنا چاہا۔ اپنا رخ پھیرنے بھی نہ پایا تھا کہ جنگل کے باہر سے کچھ کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور اسی کے ساتھ کسی نے پکار کر کہا ”مروٹ میاں آج اتنی دیر کیوں ہوئی“ آواز میں کچھ نسوانی نزاکت تھی۔ ممتاز پہلے تو کچھ سم سا گیا مگر دریافت حال کی غرض سے جنگل کے باہر نکل آیا۔ ایک بیس سال کی عورت سفید ساری پہنے ہوئے اسکی طرف آ رہی تھی لیکن ممتاز کے قریب آ کر جھجک گئی اور یہ کہہ کر ایک کنارہ ہو رہی ”دھوکا ہوا!“ ممتاز اندھیرے میں تو اس کی صورت نہ دیکھ سکا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس جوار میں ایسی سفید پوش عورت سوا ایک کے اور کون ہو سکتی ہے ممتاز واپس ہونے لگا کہ جنگل کے اندر سے کسی کے کرنے کی آواز آئی۔ ممتاز آواز پر دوڑ پڑا تھوڑی دور پر ایک گہرا نالا تھا جس میں پانی براے نام تھا۔ ممتاز نے دیکھا کہ ایک شخص اُس میں سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ رؤف ہے۔ ممتاز نے اُسکی مدد کی۔ رؤف نالے سے باہر نکلا تو اسکو احساس ہوا کہ وہ کس کے سامنے ہے۔ اُس کا اس جنگل میں ایسے نا وقت پایا جانا ہر طرح کے شبہ دل میں پیدا کر سکتا تھا۔ وہ اس خیال سے نادم تھا کہ ممتاز اپنے دل میں کیا سمجھتا ہوگا اُس نے اپنی بندوق کو جو کچھ میں لت پت تھی پتوں سے صاف کر کے کاندھے پر رکھا اور ممتاز سے کہا ”میں شام کو ادھر شکار کی غرض سے روز آنا ہوں۔ آج مجھے اپنے منشی سے ایک ضروری کام کے متعلق کچھ کہنا تھا اسلئے تیواری پور جا رہا تھا مگر اب چلو گھر واپس چلوں گا“ ممتاز نے طنز آمیز لہجہ میں کہا ”نہیں اب آپ اپنا کام پورا ہی کر لیجئے۔ آپ کا منشی جنگل کے اُس سرے پر آپ کا دیر سے انتظار کر رہا ہے“ یہ کہہ کر وہ تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ رؤف دیر تک اُس کے الفاظ پر غور کرتا رہا

وہ سمجھ گیا کہ ممتاز اُس کے راز سے واقف ہے۔

✽ (۶) ✽

مگر ضلع بستی کے اُن مقامات میں سے ہے جو تاریخی شہرت رکھتے ہیں۔ یوں تو اکثر ٹوٹے پھوٹے کھنڈر یہاں آپ کو نظر آئیں گے جن کی عبرت آموز ہیئت آپ کو ایک مٹے ہوئے تمدن کی یاد دلا کر آپ کے نازک ترین جذبات کو ابھادی ہے اور آپ اپنی آنکھوں میں نئی محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن جس چیز نے اس مگر کو سارے ہندوستان میں ایک قابل احترام جگہ بنا دیا ہے وہ کبیر داس کا روضہ ہے جو قصبہ سے اتر دیر یائے آمی کے کنارے واقع ہے اس عمارت کا نصف حصہ ہندوؤں کے قبضہ میں ہے اور نصف مسلمانوں کے۔ کبیر دراصل ایک شاعر صوفی تھے اُن کو کفر و اسلام سے کوئی سروکار نہ تھا مگر اُن کی معاشرت کچھ ایسی تھی کہ ہندوؤں نے اُن کو ہندو سمجھا اور مسلمانوں نے مسلمان۔ ظاہر پرست عوام اس حقیقت کو سمجھنے سے معذور ہیں کہ ایک ہی شخص یہ یک وقت مسلمان اور ہندو دونوں ہو سکتا ہے۔ بہر حال مرنے کے بعد کبیر کی خاک دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک حصہ کو مسلمانوں نے لیکر مقبرہ بنایا اور دوسرے حصہ سے ہندوؤں نے ایک مندر تعمیر کیا۔

یہ تو ہوئی مگر کی تاریخی حیثیت فی الحال مگر بیرونی مقامات میں جلا ہون کے بجائے ہوئے پٹروں اور پان کیلے مشہور ہے لیکن مقامی طور پر یہاں تک تاریخی خانوں کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ کوس ڈیرہ کوس تک کے فاصلہ پر رہنے والے یہاں تاریخی پینے آتے ہیں۔ ان تاریخی خانوں کو دیکھ کر انگلستان کے وہ قہود خانے یاد آجاتے ہیں جو سو لھویں اور سترھویں صدی میں کئی جہتوں سے ممتاز تھے۔ شام کو جب دن بھر کے تھکے ماندے مزدور اور جولاہے جن میں جوان ادھیڑ اور بڑھے سبھی شامل ہوتے ہیں ”بادہ فروش“ کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ اُس وقت کون سا ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس پر چہ می گوئی ان نہیں ہوتی۔ حکومت برطانیہ کی گندم ناجو فروشیوں سے لیکر آٹے وال کے بھاؤ اور ہمسایوں کی بیبیوں تک سبھی کچھ پر باؤ از بلند مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔ ان مباحثوں میں اکثر ہاتھ پائی کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ ایسے موقع پر عموماً ساتھی یا ساقیہ کی بر محل مداخلت سے جھگڑا چمک جاتا ہے اور پھر سب آپس میں ہنسنے بولنے لگتے ہیں نہیں تو فریقین کے سروں کیساتھ کوزے اور شے بھی معرض خطر میں آجاتے ہیں یہ ہفتہ میں ایک بار بڑھ کے دن مگر میں بازار لگتا ہے اس دن اُن تاریخی خانوں کی رونق میں معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے۔

جس سینچر کا ذکر کیا جا چکا ہے اُس کے چار روز بعد مگر میں بازار لگا ہوا تھا۔ بازار یوں کی آمدورفت سے سڑک آباد ہو رہی تھی۔ سہ پہر کی وقت قصبہ سے باہر سڑک کے کنارہ تاریکی کی ایک دوکان پر اور دوکانوں سے زیادہ ہجوم تھا اُسکی وجہ یہ تھی کہ یہاں جو بحث چھڑی ہوئی تھی وہ حال کے ایک واقعہ سے متعلق تھی اور اس قدر دلچسپ تھی کہ بہتیرے پرہیزگار جو تاریکی کی مہک کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔ بحث میں آکر شریک ہو گئے تھے۔

میان دروت اور مریم کے درمیان گذشتہ چھ مہینوں میں جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے انھیں ہر شخص اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا آخر کار دوکان کی مالکہ کی تائید سے ایک بڑے میان کا بول بالا رہا اور کثرتِ راسے سے مریم جادو گر نی تسلیم کر لی گئی۔ مریم کا شہرہ دور دور تھا۔ وہ تیواری پور میں گاون کی آبادی سے باہر اپنے دادا رسول شاہ کے ساتھ ایک کچے مکان میں رہتی تھی۔ اُس کو پڑوس میں آئے ہوئے سال بھر سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اُس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ بعض اسکو ہر جائی بیسواکتے تھے اور اسکو ملامت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بعض اسکو جادو گر نی سمجھ کر اُس سے کانپتے تھے۔ عام طور پر مشہور تھا کہ پریتیا کے جتنے بھوت پریت ہیں وہ سب اس کے تابعدار ہیں۔ گاون کے نو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو بڑے بڑے مریم کے پاس آنے جانے نہیں دیتے تھے لیکن چھپ چھپ کر لڑکیاں خصوصیت کے ساتھ اُس کے پاس آیا کرتی تھیں۔ مریم اُسر والی عورت تھی۔ اُس کی زبان نسبتاً صاف اور شستہ تھی۔ وہ تھوڑا بیت لکھنا پڑھنا جانتی تھی اور سینے پر دتے کے کام میں ماہر تھی۔ آس پاس کے لوگوں کو اگر نئی خط لکھوانا یا پڑھوانا ہوتا یا اگر کبھی کسی شوقین کو کوئی اچھا کپڑا سلوانا ہوتا تو مریم ہی یا دیکھ جاتی تھی۔ چونکہ مریم کو کسی کیساتھ دوستانہ لگاؤ نہیں تھا اس لئے وہ اُن کے کام اجرت پر کیا کرتی تھی۔

افواہوں کے برطرف ہو کر مریم کے بارے میں صحیح حالات جو معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔ رسول شاہ کا آبائی پیشہ فقیری تھا۔ باپ دادا کے وقت سے بھی روزی کا ذریعہ تھا۔ اور زکوٰۃ خیرات سے اُس کا روٹی کپڑا چلتا تھا۔ رسول شاہ کے باپ کے زمانہ سے کچھ کھیتی بھی ہونے لگی۔ رسول شاہ نے آمدنی کی ایک اور تدبیر نکالی وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں داخل ہو گیا جس میں اُس نے کافی بنود حاصل کر لی۔ دس بیس کو س کے حلقہ میں جان کہیں ڈاکہ پڑتا رسول شاہ اُس میں ضرور شریک ہوتا تھا۔ اب بڑی فرخت سے بسر ہونے لگی۔ رسول شاہ کے ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹی بیاہی جا چکی تھی اور سسرال میں رہتی تھی۔ بیٹے کا نام سجاد تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ راہزنی میں وہ باپ سے سبقت لے گیا تھا۔ اس عمر میں دو دفعہ وہ قید خانہ کی سیر کر آیا تھا۔ ایک دفعہ ایک ڈاکہ کے سلسلہ میں جس میں کئی خون بھی ہوئے تھے۔ سجاد گرفتار ہو جانے کے خوف سے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا اور پھر کوئی اُس کا پتہ نہ پاسکا۔ رسول شاہ عرصہ تک اس جرم میں پولیس کے ہاتھوں بندھا پھر کہ بیٹے کا پتہ جانتا ہے اور بتاتا نہیں مگر واقعہ یہ تھا کہ اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ سجاد کہاں ہے رسول شاہ قسی القلب ڈاکو ہونیکے باوجود اولاد پر دم دیتا تھا۔ بیٹے کے عمر میں وہ نہ جانے کتنے یعقوبی آنسو گر اچکا تھا مگر اُس کے ”کلبہ اخراں کو درگشتان“ ہونا نصیب نہ ہوا۔

تقریباً بیس برس بعد کلکتہ سے سجاد کی چھٹی آنی جس میں اُس نے اپنی مختصر سرگزشت بیان کر دی تھی وہ بیان سے بھاگ کر سیدھا کلکتہ پہنچا تھا اور ہر روز گارہ ہو گیا تھا۔ سال بھر بعد وہیں ایک یتیم بھکارن سے

شادی کر لی تھی دوسرے سال ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ سوئی چند سال بعد مر گئی اور لڑکی کو سجاد نے بڑی بڑی منتوں کے ساتھ پالا۔ اب لڑکی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ رسول شاہ کو خط لکھنے کی تقریب یہ تھی کہ کوئی آٹھ نو مینہ سے سجا سبی تپ میں مبتلا تھا اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی اب وہ چاہتا تھا کہ رسول شاہ جاکر اس کی بیٹی مریم کو اپنے ساتھ وطن لے آئے اور اسکو اسی طرح اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھ کر رکھے جس طرح اب تک خود سجاد نے رکھا تھا۔

رسول شاہ خط پیا کر بہت رویا اور دودن کے اندر ادھر ادھر سے کچھ نقد کا بند و بست کر کے کلکتہ روانہ ہوا۔ سجاد کی حالت ابتر تھی۔ وہ دم توڑ رہا تھا اگر رسول شاہ ایک دن اور دیر کر کے پہنچتا تو بیٹے کو زندہ نہ دیکھتا۔ سجاد میں زیادہ بولنے کی تاب نہ تھی۔ اس نے اکھڑے ہوئے جلوں میں مریم کو رسول شاہ کے سپرد کیا اور ایک آخری سانس لیکر زندگی کے جھگڑوں سے بے خبر ہو گیا۔ رسول شاہ مریم کو لے کر وطن آیا اور اسکو اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر اپنی توجہ اس پر وقف کر دی۔ مریم کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی جس کو رسول شاہ پورا نہ کرتا ہو۔ مریم بھی دادا سے بڑی محبت کرتی تھی، اور ہر طرح اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ سینے پر رہنے سے اسکو جو کچھ ملتا تھا وہ سب رسول شاہ کی ہاتھ میں لا کر دیتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر مریم اپنی آزادی اور بیاک روی میں کسی کو خلل انداز نہ ہونے دیتی تھی۔ رسول شاہ نے چاہا کہ اسکی شادی کر دے مریم نے انکار کر دیا اور رسول شاہ دوبارہ کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ مریم مردوں سے بے جھپک ملا کرتی تھی۔ رسول شاہ نے دبی زبان سے منع کیا مگر مریم نے توجہ نہ کی، وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنی عصمت اور اپنے وقار کو قائم رکھتے ہوئے مردوں کی اہلبانہ فریفتگی سے لطف اٹھایا کرتی ہیں۔ مریم خوبصورت تھی رنگ سرخ و سپید تھا۔ جسم نرم و نازک تھا اعضا کی ساخت سڈول تھی اس کے گھنے اور سیاہ بال جس وقت بکھر جاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ پھولی ہوئی شفق پر طوفانی رات مسلط ہو گئی ہے۔ وہ کپڑوں کی شوقین تھی اور ان کو ایسے سلیقہ سے پہنتی اور رکھتی تھی کہ بال سال بھر کے کپڑے نئے معلوم ہوتے تھے۔ اس وجہ سے بھی دیہاتی اسکو عامل سمجھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ چند فرمانبردار موکل ہیں جو مریم کو کپڑے اور روپے لالا کر دیا کرتے ہیں۔

مریم کو کسی دوسرے عالم کی بہار کنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اس کے حسن و جمال کی پوری تصویر کھینچنا ایسا ہی ہے جیسے کسی لطیف شعر کے اثرات کی تشریح کرنا۔ اس میں اکثر ایسے ”نکات دلبری“ تھے جنکا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا، مثلاً اسکی کالی تیلیاں تاریکی کے ان اسرار سربستہ سے معمور تھیں جنکا علم صرف آدمی رات کے جاگنے والوں کو ہو سکتا ہے اسکی آنکھوں میں جواثر تھا وہ اس کو جادو گرئی ماننے پر مجبور کرتا تھا۔ جس نے اسکی آنکھوں کا ایک بار سامنا کیا وہ اپنے دل میں ایک عجیب و غریب کیفیت لے کر گیا جس کی طرف اسکی نظر اٹھ گئی اسکا قرار دے سکون پا مال ہو کر رہ گیا۔ ایسی ہی آنکھوں کا نہ دیکھنا بقول مومن ”ننگہ التفات“ ہوا کرتا ہے۔ خود مریم اپنی آنکھوں کی سحر آفرینیوں سے اکثر مغلوب ہو جاتی تھی اسوقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ آنکھیں کھولے ہوئے سو رہی ہے اور گرد و پیش سے بالکل بیخبر ہے۔ اسکے نازک ریلے ہونٹوں کے متعلق یہ کہنا بجا ہوگا کہ باتیں کرنے کیلئے نہیں بلکہ صرف چوسے جانے کیلئے اور بوسوں کے ہجان سے کپکپانے کیلئے بنائے گئے تھے۔

مریم بلاناغہ صبح و شام جنگل اور ندی کی سیر کے لئے نکلتی تھی اسکو قدرت اور قدرت کی نیرنگیوں میں تنہا رہنے کی لت تھی مگر میوں میں شام کو جب وہ لیٹ چھٹکا کر آبی کے کنارے کھڑی موجوں کا تماشا دیکھتی ہوتی تو کسی طرح اسکو اس عالم عناصر کی مخلوق تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا کہ جنگل کی دیوی ہے یا کوئی جل پری جو آسمان والوں کو بھی سر بسجود کر کے چھوڑے گی یا پھر زہرہ مشتری کی کوئی بجنس ہے جو کسی فرشتہ کی ملکوتیت خاک میں ملا کر نشاے کی پھر اگر تنگ خیال دیہاتی اسکو جادوگر نہ سمجھتے تھے تو کوئی حیرت کی بات نہ تھی وہ اس جوار میں کم از کم ایک اجنبی سی چیز ضرور تھی۔

رووف نے پہلی بار مریم کو اسی آن سے دیکھا تھا اور اسکی صورت کا پروہت بنگیا تھا۔ رووف کے لئے یہ ایک نیا تجربہ تھا جسے اسکو بے قابو کر دیا وہ اب تک نہ جانے کہاں کہاں اپنا دل لگا چکا تھا، لیکن اس کے دل میں کوئی تغیر نہیں ہوا تھا۔ اب اس نے اپنے دل کو متغیر ہوتے ہوئے پایا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی ایک نئی کیفیت تھی۔ مریم دوسری عورتوں کی طرح نہ تھی جسپر ایک بارگی دسترس پا کر رووف پھر قطع نظر کر لیتا۔ مریم کو رووف کی افتادگی میں لذت ملی وہ اسکی بواہوسی کے کارنامے سن چکی تھی وہ اپنے کو آسانی سے سپرد کر دینے والی ضعیف الاعصاب عورتوں میں سے نہ تھی۔ وہ اپنے دامن کو آلودگی سے بچائے ہوئے رووف کی دل کی آگ کو بھڑکا رہی تھی اور اس سے لطف اٹھا رہی تھی۔ ڈیڑھ سال یوں ہی گزر گیا اور رووف کے شوق کی آگ تیز ہوتی گئی لیکن مریم کے جلال حسن کے سامنے اسکی اتنی ہمت نہ پڑی کہ اپنی متناؤں کو سیراب اور سرسبز کرنے کی کوشش کرے۔ نہاچار انکو اپنے دل کے خون سے سینچتا رہا، وہ مریم کا بے عذر غلام ہو کر رہ گیا تھا اسکی گردیدگی کا چرچا دور دور پھیل گیا تھا۔ گھر والوں سے بھی حقیقت حال چھپی نہ رہ سکی۔ رابعہ اپنی سرنوشبت کو کوس رہی تھی اس لئے کہ رووف میں جو زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو گیا تھا وہ اسکی برداشت سے باہر تھا۔ رووف رات رات بھر مریم کے خیال میں تڑپا کرتا تھا۔ اب تک اس نے جو بے عنوانیاں کی تھیں وہ اپنے لئے کہیں تھیں۔ رابعہ کے ساتھ اس کا برتاؤ بدستور قائم تھا مگر اب اسکو رابعہ سے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔ اس نے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اپنے کو مریم کے حوالہ کر دیا۔

(۷)

زمانہ داغ بھی دیتا ہے اور زمانہ اسکو مٹا بھی دیتا ہے۔ ادریس کے دل کو جو داغ لگا تھا وہ کچھ اس کلیہ سے بری نہ تھا وہ اپنے ”غم عشق“ کو بھول چکا تھا اور اب ”غم روزگار“ میں سرگرم تھا اس نے بی۔ اے امتیاز کے ساتھ کیا تھا۔ اسکو بارہ بنگی میں اسکول کی ہیڈ ماسٹری مل گئی وہ اس کام کے لئے فطرتاً موزوں تھا۔ وہ اب بھی لڑکوں کو گھر پر پڑھاتا تھا اور اس طرح مینے میں اسکی اوسط آمدنی دو سو روپیہ کی تھی، اسکا ذاتی خرچ بہت کم تھا، کم از کم دو ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار مال کو بھیج دیا کرتا تھا، اسکی نہ کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب دن پلٹ رہے ہیں اور اگرچہ وہ اپنی زندگی کا نصف حصہ طے کر چکی تھی اور زمانہ کے اس نئے دور کی راحتوں سے خود اسکو زیادہ عرصہ تک بہرہ اندوز ہونے کی امید نہ تھی مگر وہ اس

خیال سے خوش تھی کہ بیٹے کے اچھے دن آگئے ہیں اور اسکی زندگی آرام کی زندگی ہوگی۔ تین سال کے اندر ادیس کی زمینداری میں بھی کچھ اضافہ ہو گیا تھا گانوں والے بھی ادیس کے گھر کو خوشحال دیکھ کر مالک تقدیر کی درگاہ میں شکر ادا کر رہے تھے۔ ادیس اپنے حسن اخلاق سے دلوں میں گھر کے ہوئے تھا۔ کاشتکاروں کے ساتھ اسکو دینی ہمدردی تھی۔ اکثر خود تکلیف اٹھا کر وہ ان کے برے وقت میں کام آجایا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ گاؤں والے بھی اسکی خوشی اپنی خوشی اور اسکی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھتے تھے۔ مرد عورت چھوٹے بڑے سب اس کے گھر کے کام بلا اجرت کیا کرتے تھے۔

ادیس چھٹیوں میں برابر آیا کرتا تھا۔ ماں کے علاوہ اگر وہ کسی سے مل لینا ضروری سمجھتا تھا تو وہ ممتاز تھا اس کے دو اسباب تھے ایک تو ممتاز کے ساتھ اس کے بچپن کی یاد دہانہ تھی۔ دوسرے ممتاز کی شخصیت کا قایل تھا اور اسکا دل سے احترام کرتا تھا۔ ممتاز کو بھی ادیس کے ساتھ روحانی خلوص تھا۔ وہ ادیس کو ایک ”معصوم گمراہ“ سمجھتا تھا جو اتفاق زمانہ سے مجبور ہو کر سکون و طمانینت کی راہ کھو بیٹھا ہے اور اب جس کو زندگی میں سوا دکھ کے کچھ نظر نہیں آتا۔

ادیس کو ملازمت کرتے ہوئے تقریباً ساڑھے تین سال ہو گئے تھے۔ اس درمیان میں اسکی صحت کچھ خراب ہونے لگی تھی۔ اب اپنے لئے وہ اسکی سخت ضرورت محسوس کرتا تھا کہ شہر اور تمدن کے ہنگاموں سے دور کسی گوشہ عافیت میں جا کر سکون قلب حاصل کرے۔ اسکی بہترین صورت یہ تھی کہ اپنے گاؤں پر جا کر رہے اور جو کچھ نقد اسکے پاس موجود ہے اسکو کسی کاروبار میں لگا کر حلال کی روٹی کھا سکے۔ گذشتہ سال اس نے پورے سال بھر ایک متمول تعلقدار کے لڑکے کو مفت پڑھایا تھا۔ صاحبزادے کچھ ایسے خدا کے سنوارے ہوئے تھے کہ تین سال سے جان توڑ کوششیں کر رہے تھے اور کسی طرح انٹرنس پاس نہیں ہوتے تھے، ادیس نے ان کے ساتھ بڑی جانفشانی کے ساتھ محنت کی اور اب کے سال وہ کامیاب ہو گئے، ان کے گھر والوں کو دریاوی سوچھی تو ادیس کو کمبخت دو ہزار روپے دے ڈالے، ادیس کو ان روپیوں سے بڑی تقویت ہو گئی تھی اب وہ بلا کسی قسم کی دقت کے نوکری سے کنارہ کش ہو کر آرام نگر میں گوشہ گیر ہو سکتا تھا۔ اسمیں اسکا ایک مقصد اور بھی تھا۔ ملک میں سیاسی شورشیں شروع ہو چکی تھیں ادیس میں بچپن سے بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کا مادہ موجود تھا اور رفتہ رفتہ یہ مادہ غالب ہو رہا تھا وہ جانتا تھا کہ اپنی تنہا ذات سے ساری دنیا کو فائدہ نہیں پہنچایا جاسکتا۔ اسلئے اپنی قوم اور اپنے ملک کے لئے جو کچھ انسان کر سکتا ہے ضرور کرنا چاہئے۔ ہندوستان کی آبادی کا زیادہ حصہ ان پڑھ اور بھوکے کسانوں پر مشتمل ہے۔ ادیس محسوس کر رہا تھا کہ سب سے پہلے انہیں کی حالت کو سدھانے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ ترقی نہیں کرتے ملکی ترقی کا شور باد پیمانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اسلئے ادیس نے یہ سوچا تھا کہ رام نگر میں چندہ اکٹھا کر کے ایک مدرسہ کھولے گا اور پڑوس کے دیہاتوں میں اتنی تعلیم پھیلانے کی پوری کوشش کرے گا جتنی کہ ان کی بہبودی کے لئے ضروری ہے۔

ادیس نے پیشتر ہی سے ممتاز اور سکینہ کو مطلع کر دیا تھا۔ گرمی کی لمبی تعطیل میں وہ استعفا داخل کر کے چلا آیا۔ آتے ہی ایک طرف تو وہ ممتاز کی دوکان میں پانچ سو روپیہ لگا کر حصہ دار ہو گیا اور دوسری طرف مدرسہ قائم کرنے کے لئے زمینداروں سے

ان کی حیثیت کے مطابق چندہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ اس کار خیر میں ممتاز بھی اسکا شریک تھا۔ رام نگر اور یوسف پور کے درمیان ایک پرفضا آم کا باغ ہے اسی میں ایک بڑی چھوٹی ڈاکی گئی اور مدرسہ کا افتتاح ہو گیا۔ گانوں گانوں اس کا چرچا پھیلنا۔ دور دور سے لڑکے آکر بھرتی ہونے لگے ممتاز بھی ایک گھنٹہ روزانہ کو پڑھانے میں صرف کرتا تھا۔ اسکے بعد دوکان کی نگرانی میں لگ جاتا تھا۔ ادیس زیادہ تر مدرسہ کے کام میں مشغول رہتا تھا۔

(۸)

مریم نے جب پہلی بار یہ سنا تھا کہ ادیس جو یار ان وطن کی ”بے مہریوں“ دلیہ ہو کر پردیس چلا گیا تھا۔ اب غربت کی بنا پر گلو سے مجبور ہو کر بھڑوٹن آنے والا ہے۔ اسی وقت اس نے اپنی رگوں میں ایک خفیف ہجان محسوس کر لیا تھا۔ وہ ادیس کی پوری سرگشت جانتی تھی۔ اس کو ادیس سے غایبہ انس پیدا ہو گیا تھا، وہ یہ بھی سن چکی تھی کہ ادیس کی صورت بڑی دلکش ہے اسلئے اسکو کم سے کم ایک بار دیکھنے کی مشتاق تھی۔

ادیس کو آئے ہوئے پانچ چھ مہینہ ہو گئے تھے اور مریم کو اسے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے کو چھپا کر ادیس کی جھلک دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اسکی اب تک کوئی تدبیر اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی لیکن کبھی کبھی مسبب الاسباب کی طرف سے ہماری مراد بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ مریم کے پرستاروں میں ایک پٹھان کالڑ کا بھی تھا۔ جس کا نام نور محمد تھا، اسکی عمر کوئی بیس بائیس برس کی تھی۔ وہ یوسف پور کا رہنے والا تھا اور رسول شاہ کے کھیت کھلیان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ وہ مریم کی صورت کا پردانہ تھا۔ مریم اس کی دالمانہ نگاہوں کا اپنی پر خلوص مسکراہٹ سے جواب دے دیا کرتی تھی۔ نور محمد اس کو بھی غنیمت سمجھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مریم سے اس سے زیادہ امید نہیں کیجا سکتی۔

ایک روز سوچتے سوچتے مریم نے سوچا کہ نور محمد کو اپنا ہمارا بنانا چاہیے اور اسکی شفقتگی سے کام لینا چاہیے۔ جب دوسرے دن شام کو نور محمد اپنا کام ختم کر کے اور مریم پر ایک حسرت بھری نظر ڈال کر گھر جانے لگا تو مریم نے کہا ”نور محمد میں بھی تمہارے ساتھ مذی تک چلوں گی۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا ہے“ مریم کا لہجہ آج کچھ غیر معمولی سا تھا نور محمد رک گیا۔ مریم اس کے ساتھ ہوئی۔ راستہ بھر وہ خاموش تھی اور نور محمد متحیر دریا کے کنارے ہو چکا مریم نے نور محمد پر اپنی مسحور کر دینے والی نگاہیں جما کر کہا ”نور محمد مجھ کو چاہتے ہو؟“ نور محمد کا دل دھڑکنے لگا۔ مریم نے اس سے پہلے اسکو کبھی اس طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔ نور محمد اپنے رگ و پے میں ایک بڑی محسوس کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے اسکی زبان بند ہو گئی، لیکن جب مریم نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے بھڑائی ہوئی آنکھوں میں کہا ”اسکا جواب میری آنکھوں سے مل سکتا ہے“ مریم نے کہا ”دیکھو میں کسی کی محبت نہیں کر سکتی البتہ تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں۔ یقیناً نور وف میاں سے کہیں زیادہ میں تمہاری قدر کرتی ہوں، میں تم سے کوئی ایسے وعدے نہیں کر سکتی جس کو پورا نہ کر سکوں اور بعد کو شرمندہ ہوں اور تم با یوس + میں تم کو ایک بار اپنا منہ چومنے کی اجازت دے سکتی ہوں مگر شرط یہ ہے کہ تم بھی میرا ایک کام کسی طرح کر دو“

نور محمد کی دنیا چمک اٹھی اس نے بغیر آگاہی سوچے ہوئے کہا ”مریم اس دولت کو پانے کے لئے جو کو کرنے کے لئے تیار ہوں“ مریم نے اپنا منہ نور محمد کے منہ کے قریب کر کے کہا ”اچھا لوچو م لو“ نور محمد نے ہچکچاتے ہوئے اس کا بوسہ لے لیا۔ مریم نے اسکو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ اس لذت کو پوری طرح محسوس کرے۔ مریم نے فوراً کہا ”میں نے ادیس میاں کی شہرت اس فوج میں بہت سنی ہے۔ میں ذرا ان کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں کہہ سکتی کہ میرے دل میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوئی۔ بہر حال اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم میرے لئے اس کی کوئی تدبیر نکالو“ دفعۃً نور محمد کا دل سرد ہونے لگا مگر وہ مریم سے معاملہ کر چکا تھا اور اب پلٹنا اس کا کام نہ تھا۔ اس کی صورت سے حسرت اور بیچارگی شک ہے تھی۔ اس نے غیر معمولی ضبط سے کام لیا اور کہا ”اچھا اب کی جمعرات کو لشن گڈھ کا میلہ ہے۔ اگر تم چار کوس آنے جانے کی تکلیف برداشت کر سکو تو میرے ساتھ چلو۔ وہاں تم جس کو دیکھنا چاہتی ہو دیکھ لو گی اور بھڑ میں تمہیں خاص طور پر کسی کی نظر بھی نہ پڑے گی“ مریم پر دھیرے دھیر ادیس کو دیکھنے کا جن سوار ہو گیا تھا۔ وہ دھن والی عورت تھی اور اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہر طرح کی صعوبت گوارا کر سکتی تھی۔ اس نے تین دن تڑپ تڑپ کر گزائے۔

لشن گڈھ خلیل آباد اسٹیشن سے ڈیڑھ دو کوس دھن سے وہاں ہر سال ہندوؤں کا ایک میلہ ہوتا ہے۔ جگہ ٹھٹھا اچھا خاصہ رہتا ہے جس میں ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں۔ اس ملک میں ہندو مسلم اتحاد و مشارکت کی امید اگر ہوتی ہے تو وہ نہیں کہ ”مست جاہل مکر صاف باطن دہقانوں کو دیکھ کر ہوتی ہے ورنہ شہروں کو تو شہریت کا دیوتا“ اتنا غارت کر چکا ہے کہ بظاہر ہندوستان کی قومی اصلاح کے آثار نظر نہیں آتے۔

ممتاز اور ادیس دونوں نے یہ رائے قائم کی تھی کہ لشن گڈھ چل کر عام مجمع میں مدرسہ کے فواید بیان کر کے چندہ کی تحریک کریں۔ نور محمد ان کے ارادے سے واقف تھا۔ جمعرات آئی تو وہ بڑے سویرے مریم کو لے کر لشن گڈھ پہنچا، جاڑے کا زمانہ تھا، ادیس اور ممتاز مدرسے کے کچھ در ایک میدان میں تخت بچھائے ہوئے بیٹھے تھے۔ سامنے تقریر سننے والوں کی بھڑ تھی۔ پوجا سے فارغ ہو کر لوگ سب سے پہلے اسی طرف آتے تھے۔ ادیس اور ممتاز اپنا سارا زور اس بات پر صرف کر رہے تھے کہ ان سادہ لوح دلوں کو تعلیم و تعلم کی ضرورت محسوس ہو جائے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بناس رہا تھا۔ درمیان میں جس کو جو کچھ بطور چندہ کے دینا ہوتا وہ اپنی جگہ لے اٹھتا اور ممتاز کے آگے چپکے سے لے جا کر رکھ دیتا۔ ممتاز کے سامنے پیسوں اور دوسرے چھوٹے سکوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ مریم کو نور محمد نے قریب ہی ایک دوکان پر بٹھا دیا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی۔ ادیس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی مریم کے دل میں تناؤں کا ایک خروش تھا۔ اس نے یوسف کے حسن کی داستان پڑھی تھی۔ آج اسکو معلوم ہوا کہ حسن واقعی ایسی ہی چیز ہے جو زینا اور اسکی ہم جنسوں کو ”پردہ عصمت“ سے باہر نکال کر چھوڑتی ہے۔ روف، ادیس کی گرد بھی نہ تھا۔ مریم کی سمجھ میں نہ آیا کہ اگر رابعہ کے والدین نے دولت کے لالچ میں روف کو ادیس پر ترجیح دی تو خود رابعہ ادیس کے خیال کو اپنے دل سے کیسے نکال سکی۔ شام تک ادیس اسی تخت پر بیٹھا دھواں دھار تقریر کرتا رہا اور شام تک مریم اپنی جگہ سے دم بخود اس کو دیکھتی رہی اور

اور پھر بھی اسکا جی نہ بھرا۔ اس کو اپنی بھوک پیاس کا بھی ہوش نہ تھا۔ محبت کی ابتدا شاید یونہی ہوتی ہے کہ محبوب کو بہروں محویت کے ساتھ دیکھا کیجئے اور پھر جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو تو حسرت و دیدار کا وہی عالم ہو جو دیکھنے سے پہلے تھا، مریم گھر واپس آئی تو اسکے دل میں خلش نہیں بلکہ درد تھا، جس سے اسکی رگ رگ سیکل تھی۔

مریم کو اس کے بعد کوئی تین ماہ تک ادریس کے دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ مگر اسکی محبت شعلہ زن ہوتی رہی۔ وہ جلی جاری تھی اور کستی طرح جل نہیں سکتی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ رُوف سے ملنا کم کر دیا اور آخر کار رُوف سے ایک دن صاف صاف کہہ دیا کہ میں اب اپنے اور تمہارے دونوں کے لئے بہتر سمجھتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے سے ملنا بند کر دیں۔ تم اب اپنی اور رابعہ کی زندگی سدھارو۔ میں کسی سے سچا خلوص نہیں رکھ سکتی۔ رُوف مریم کا بھید نہیں جانتا تھا، اس نے لاکھ چاہا کہ مریم اس سے قطع نظر نہ کرے، لیکن اس کا کوئی زور نہ چل سکا۔ مریم نے فیصلہ کر دیا اور رُوف مایوس ہو کر چلا گیا۔ اس نے درمیان میں کئی بار مریم سے گفتگو کی مگر مریم اس سے کتراتے رہی۔ ناچار رُوف کو رابعہ کے ساتھ از سر نو منہمک ہونا پڑا، اگرچہ مریم کا داغ اسکے دل سے کبھی نہیں گیا۔

(۹)

پھاگن کے دن تھے۔ ہولی گزر چکی تھی۔ ہوا اپنا زور بھر رہی تھی گویا گزشتہ موسم کی جو افسردگی اور مردنی بطور یادگار باقی رہ گئی ہے اسکو دور کرنے کے لئے اپنی تمام قوت صرف کر رہی ہے۔ بسنت رت کا چپہ چپہ سے اعلان ہو رہا تھا۔ سبزہ زار اور چراگاہ ابھی سوکھے پڑے تھے۔ جھاڑیاں بے جان اور برہنہ تھیں لیکن بالیدگی نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ڈھاک میں نئی پولیس نکل رہی تھیں۔ اور وہ زمانہ آگیا تھا کہ پریتیا اپنی عروسی خلعت سے آراستہ ہو جائے۔ فضا صدائوں سے معمور تھی چرند پرند نے اپنی رام کہانیاں چھیڑ دی تھیں۔

ادریس اور ممتاز دونوں اپنے مشترکہ کارباروں میں روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ دولت و اقبال کی دیوی جسکی دوستی اور دشمنی دونوں ناقابل اعتماد ہیں ان پر مسکرا رہی تھی۔ مدرسہ چل رہا تھا اور دوکان تو ممتاز کے حسن انتظام سے اس طرح چمک اٹھی تھی کہ اس سے جو منافع ہوتا تھا اس کا آدھا غلے اور اینٹوں کی تجارت میں لگانا پڑا۔ ممتاز اور ادریس زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی خرید رہے تھے، مگر دونوں کی معاشرت ویسی ہی سادہ اور نمائش سے عاری تھی۔ ادریس میں شہری زندگی کی صرف ایک برائی تھی۔ وہ چائے پیتا تھا۔ ممتاز کو بھی چند مہینوں میں یہ لت لگ گئی۔

تیواری پور میں ایک آنہ حصہ ایک بننے کا تھا جس میں کچھ آم ہوئے اور کٹھل کے درخت بھی تھے باقی رُوف کا حصہ تھا۔ بنیا رُوف کا بری طرح مقروض تھا۔ رُوف نے اسکو تناشر شروع کیا۔ غرض یہ تھی کہ بنیا کسی طرح تنگ آکر وہ ایک آنہ حصہ بھی اس کے حوالہ کر دے۔ مگر بنیا بھی اپنی ہنٹ کا آدمی تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ بغیر اس ایک آنہ کو جدائے چھٹکارا نہیں ہوتا تو اس نے قسم کھالی کہ رُوف کے ہاتھ کبھی نہ بیچوں گا۔ اس لئے وہ ادریس کے پاس آیا اور اس سے معاملہ کیا۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ صرف

کھیتوں اور درختوں کو ایک نظر دیکھ لیا رہ گیا تھا۔ بننے کے جانے کے بعد ممتاز اور ادریس نے صلح کی کہ صبح طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر چلیں اور سب کچھ دیکھ بھال کر دس بجے تک واپس آجائیں۔

رات کا سماں دلکش تھا۔ دن بھر کی تپش کے بعد اس وقت ہوا میں ایک مسکن خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن ممتاز اور ادریس جاگ رہے تھے۔ ممتاز کو سویرے سو جانے کی عادت تھی۔ ادریس پر کبھی کبھی بخوابی کا دورا پڑ جاتا تھا۔ ایسی حالت میں ممتاز اسی کے مکان پر سویا کرتا تھا اور شب بیداری میں اس کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ ساری رات مباحثوں میں کٹ جاتی۔

آج شام کے وقت رام نگر میں ایک بلبل سی جی تھی۔ ایک گوالے کا لڑکا جو تمام دن پریتیا میں اپنے مویشی چراتار ہا شام کو گھر لوٹا تو اسکو تیز بخار چڑھا ہوا تھا اور سر سانی حالت تھی۔ ڈاکٹروں سے اگر لڑکے لی جاتی تو وہ فوراً ”ضرر بہ الشمس“ یا ”تب حرقہ“ بتاتے، مگر دہقانوں کا نظریہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ رام نگر والوں کو یقین تھا کہ لڑکے کو آسیب ہو گیا ہے اور یہ پریتیا سے کسی بھوت کا کام ہے جس میں کار فرما مرم ہے۔ ادریس کا دماغ بھی آج اسی عقدہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ممتاز سے حجت ہو رہی تھی۔ ممتاز ادریس کی طرح کوئی فلسفی نہ تھا۔ وہ جو کتنا عقدا دعائی ہوتا تھا۔ اگر وہ ادریس کو قائل نہ کر سکتا تھا تو خود بھی کبھی قائل نہ ہوتا تھا اور بحث زیادہ تر دونوں کے سکوت پر ختم ہوتی تھی۔ آج ادریس اپنی تمام منطق زندگی کو اک بلا ثابت کرنے میں صرف کر رہا تھا۔ ممتاز اس سے متفق نہ تھا۔ آخر کار ادریس نے کہا ”کم از کم ہمارے مشاہدات اور تجربات ہی بتاتے ہیں کہ قدم قدم پر ہم کو غارت کرنے کے لئے قوتیں سلط ہیں۔ اس گوالے کے لڑکے تو دیکھو اس نے خود تو اپنے کو بیمار ڈالانا نہیں اور نہ اس معصوم کے کسی گناہ کا پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ مصیبت کیوں اس پر نازل کی گئی۔ یہ کسی ایسی اسی کا کام ہے جو ہمارے تہا سے قابو سے باہر ہے اور جو دراصل گناہ و ثواب کا امتیاز نہیں جانتی۔“

ممتاز نے جواب دیا ”اگر تمہارا کہنا مان بھی لیا جائے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم کو بلاؤں کا مقابلہ کرنا ہے۔ زندگی تو اس سے بلا ثابت نہیں ہوتی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ زندگی محض جہد للبقا نہیں بلکہ جہد للارتقا ہے اور اس کے لئے حالات و موانع لازم ہیں ورنہ ارتقا کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔“ اسی پر دونوں چپ ہو گئے تھے اور اپنی اپنی جگہ کچھ سوچنے لگے تھے۔ تین بجے دونوں ملکر چائے تیار کی اور ایک گھنٹہ بعد مکان سے چل کھڑے ہوئے۔ پریتیا کے قریب پہونچکر ممتاز نے کہا ”دیکھو ادریس سماں کتنا سہانا ہے، سعدی نے اسی ہی وقت کے لئے کہا ہے:-

بامداد ال کہ تفادت نہ کند لیل و نہار خوش بودا من صحر او کا شائے بہار

ادریس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”جس کا جو جی چاہے کہہ لے مگر حقیقت یہ ہے کہ ”در دست دیگر است خزان و بہار ما“ ایسی حالت میں ہماری خزان و بہار ہی کیا۔ چاہے آپ بہار میں غزلخوانی کیجئے اور خزان کا رونا روئے یا خزان سے زبردستی لذتیں حاصل کیجئے اور بہار پر اپنا دل خون کیجئے میں دونوں کو یکساں سمجھتا ہوں۔“ ممتاز پھر چپ ہو گیا۔ بیچ جنگل میں پہونچکر اکیس نے ہر سکوت توڑی۔ نہ جانے کیوں اس نے ممتاز سے پوچھا ”کیوں ممتاز!

”رابعہ کے بارے میں اب تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا اب بھی اس کو اسی طرح چاہتے ہو؟“ ممتاز نے جواب دیا ”ہیں بھی تم سے یہی سوال کر سکتا ہوں، لیکن مجھے چونکہ تمہارے جذبات معلوم ہیں اس لئے خواجہ زادہ تم کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ رابعہ اب تمہارے لئے کچھ نہیں رہی.....“

اور اسی نے بات کاٹ کر کہا ”رابعہ ہی نہیں بلکہ دنیا کی کوئی عورت کچھ نہیں رہی“

”خیر یونہی سہی“ ممتاز نے رفع تکرار کے لئے تسلیم کر لیا اور اپنی محرومیوں کی طرف رجوع کیا ”میرے لئے رابعہ وہی ہے جو پہلے تھی۔ مجھے اس سے امیدیں کبھی نہ تھیں اس لئے مایوسی بھی نہیں ہوئی۔ پہلے وہ تمہاری ہونے والی تھی اب روف کی ہوگئی۔ مجھے کچھ تو تمہارے خیال سے اور کچھ خود اس کے خیال سے تکلیف تو ضرور ہوئی کیونکہ روف کو میں برخلاف رابعہ کے والدین کے رابعہ کے لئے بدترین شوہر ہمیشہ سے سمجھتا تھا۔ لیکن جہاں تک میری اپنی ذات متعلق ہے رابعہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے ایسا یوں سمجھو کہ میری محبت اپنی اصلی حالت پر قائم ہے۔ محبت مجبوبات سے شروع ضرور ہوتی ہے مگر اسکی ہر تبدیلی کے ساتھ بدلتی نہیں رہتی۔ میں محبت کو ارتقاء شخصیت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ کسی موہنی صورت کا دیوانہ ہونا دراصل اپنے دل کا دیوانہ ہونا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر رابعہ کو لوگ میرے ساتھ بیاہنا چاہتے تو میں انکار کر دیتا۔ میں سب کچھ سچ کر اس سے شادی کرتا اور ممکن ہے اس وقت صورت حال کچھ اور ہوتی۔ لیکن بحالات موجودہ جبکہ مجھ کو رابعہ کے ساتھ کو ظاہری لگاؤ نہیں ہے میں اپنے کویوں تسلی دیتا ہوں :-

نہیں نگار کو الفت نہ ہونگار تو ہے روانی روش دوستی ادا کئے !!

اور اور اسی تم یقین مانو یہ تسلی جھوٹی تسلی نہیں ہے۔“

اور اسی آج ممتاز کی زبان سے ہینگل اور گیتے کا فلسفہ محبت سن رہا تھا جس کی دل ہی دل میں داد دیے بغیر زہرہ سکا۔ لیکن چونکہ اس قسم کی باتیں کبھی اس کے حلق سے نیچے نہیں اتریں اس لئے حسب عادت چڑھ کر بولا ”میں بشریت کے دائرہ سے باہر جانا نہیں چاہتا۔ تم نے جو کچھ تصوف بکا ہے وہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو جان کھو کر قاتل کوخوں بہا دیتے ہیں اور زبان کٹنے پر خنجر کو مر جا کتے ہیں۔ اور تمہیں کہو ایسے لوگ ہیں کتنے؟“

ممتاز نے یہ کہہ کر بحث کو چھوڑ دیا ”تم نے میرے متعلق پوچھا تھا۔ میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ساری ضدائی سے مجھے کیا کام۔“

جنگل کی مسافت طے ہو چکی تھی مشرقی افق سورج کی نرم کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ ہر طرف ایک دھندلی روشنی پھیل رہی تھی سامنے دریا تھا جس کی ہلکی ہلکی لہریں سورج کی سنہری کرنوں کو جذب کر رہی تھیں۔ اس منظر نے اور اسی اور ممتاز دونوں اپنے اندر ایک فرحت محسوس کرنے لگے۔ اتنے میں دونوں نے کچھ دیکھا، اور اسی کو تو یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ کچھ ایسا مبہوت ہو گیا تھا۔ ممتاز نے اور اسی کے استغراق کو محسوس کر لیا۔

مریم ندی کے کنارے بنے جس و حرکت ایک بت کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک تہنم تھا اور وہ لہروں کی سیر میں بنے خود تھی۔ ادریس کو یونانیوں کی آردور ایا آگئی اس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یا تو آج وہ اس دورِ معصومیت کے یونان میں سانس لے رہا ہے جبکہ نوریوں اور خاکیوں میں غلاما تھا یا الف لیلہ کا زمانہ سیکڑوں گردشوں کے بعد پھر آگیا ہے اور وہ کسی پری بانو کے سامنے پہنچ گیا ہے۔ ادریس کی رفتار سست ہو گئی تھی، ممتاز بھی قدم سے قدم ملاے چل رہا تھا۔ جب دونوں کچھ دور نکل گئے تو ادریس نے مڑ کر مریم کو ایک نظر پھر دیکھا۔ اس نے بہت چاہا کہ خاموش رہے لیکن آخر کار نہ رہا گیا اور اس نے ممتاز سے پوچھا ”ممتاز تم جانتے ہو یہ کون ہے؟“ اسکو دیکھ کر مجھے بسیا ختم یہ شعر یاد آ رہا ہے :-

تو غنچہ ز سحر دمن چراغ صبح دم تو خندہ بر لب من جاں آستیں دارم
ممتاز کا دل نہ جانے کس خطرہ کے احساس سے دھڑکنے لگا، لیکن اس نے اپنی حالت کو چھپا کر بے پروائی کیساتھ کہا ”مریم ہی ہے“ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ ادریس مریم کے نام سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا۔ جس کام کو انجام دینے کے لئے دونوں تیواری پور گئے تھے وہ پورا ہونے کو تو ہو گیا مگر ادریس کے بشرہ سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا دل کہیں اور ہے۔ ممتاز اگر نہ ہوتا تو شاید تیواری پور کا کام بھی رہ جاتا۔

(باقی آئندہ)

مجنوں گورکھپوری

ایک شاعر کا انجام

مصنفہ نیاز فچیپوری

ایڈیٹر نگار کا سب سے پہلا افسانہ حسن و عشق، جسمیں تخیل کی بلندی، زور تحریر، اسلوب بیان اور ندرت انشاز کے ایسے پاکیزہ نمونے موجود ہیں جو ساحری کی حد تک پہنچتے ہیں۔ جوش محبت کے جذبات جس مستانہ پن سے اس تصنیف میں ظاہر کئے گئے ہیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہ فسانہ جنانیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے قیمت مع محصول ڈاک ۱۲/-

”مینجر نگار۔ لکھنؤ“

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

— (بہ سلسلہ سابق) —

خواب کا اسلوب ماہیت و امام غزالی کا نظریہ

المنظون مطبوعہ قاہرہ ورق ۵ طبع ۱۳۲۸ھ کے حوالہ سے میکڈونلڈ نے امام غزالی کے وہ فلسفیانہ مباحث پیش کئے ہیں جن میں انھوں نے خواب کی حقیقت

اور اسکے طریق حدوث کے متعلق عقلی اور نقلی پہلو سے روشنی ڈالی ہے، امام غزالی نے صحیح حدیث قال (لبنی صلی اللہ علیہ وسلم من رآنی فی المنام فقد رآنی فان الشیطان لا یتخیل) کے روایات حضرت انس رضی اللہ عنہ دوسری میں جو حضرت ابی ہریرہ کی روایت سے ہے ولا یتمثل الشیطان بی - ہے کی جو فلسفیانہ تاویل کی ہے وہ ملک کے ان علم برداران جدل و تنقید کے لئے باعث عبرت ہے، جو اپنے و لولہ قدر امت پسندی اور انہماک عقاید عامیانہ میں صحیح استنباط نتائج سے محروم رہ جاتے ہیں یہ مانا کہ وطن کے بعض متکلمین کے بعض مجتہدانہ خیالات اور افکار قابل رد ہیں، مثلاً اثبات نازسہ گانہ اور انکار معاد وغیرہ مجھے بھی اس قسم کی فکر و احساس سے سخت اختلاف ہے، لیکن یہ کیا غضب ہے کہ معائب احساس کے مطالعہ سے انسان اپنی حریت فکری اس حد تک کھو بیٹھے کہ اسے محاسن افکار نظر ہی نہیں آئیں علمائے ملت، اور ادباً قوم کا تو فرض تھا کہ وہ دلائل اور براہین سے ان مسائل پر تاقدانہ روشنی ڈالتے، لیکن اسکے بدل انھوں نے مجالس خاص عام میں سب و شتم کر کے اپنے اطمینان قلب کا سامان پیدا کرنا چاہا، اہل نبیش اور ماہرین خصایص نفسی جانتے ہیں کہ یہ ظہار عجز و ناتوانی کی ایک طفلانہ ہنگامہ آرائی ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں، جو شخص رؤیا (خواب) کی حقیقی ماہیت نہیں جانتا، وہ اقسام رو یا کے مختلف حقائق سے بھی نا بلد ہے، اور جو شخص آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کے رؤیا کی حقیقت نہیں جانتا وہ خدا تعالیٰ کی رویت خواب سے بھی نا واقف رہتا ہے، اس لئے ایک عامی انسان یہ تصور کرتا ہے کہ جو شخص نبی صلعم کو خواب میں دیکھتا ہے، وہ گویا خاص آپ کے جسد مبارک کو دیکھتا ہے، لیکن جس طرح نفس میں ایک پر تو خیال آتا ہے، اور وہ قوت مصورہ کی بدولت لفظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اسی طرح ہر اثر نفس کے لئے قوت مصورہ ایک خاص شکل تجویز کرتی ہے کوئی شخص آن حضرت صلعم کے خاص جسد مبارک کو کیونکر دیکھ سکتا ہے، جب آپ کا جسم مبارک مدینہ منورہ میں سپرد خاک ہے اور اسے چھوڑ کر اس مقام میں نہیں جانا جہاں ایک آدمی نے خواب میں دیکھا، اور اگر چلوگ یہ مان بھی لیں کہ ہاں یہ خاص آپ کا جسد مبارک ہی رہتا ہے تب بھی یہ بحث پیدا ہوتی ہے، کہ ایک ہی رات میں ہزاروں آدمی آن حضرت کو مختلف

صورتوں میں دیکھتے ہیں عقل سلیم کہتی ہے، کہ ایک ہی شخص کو لوگ بیک وقت دو مختلف صورتوں میں نہیں دیکھ سکتے لیکن غالباً وہ کہہ سکتا ہے، جسے اس نے خواب میں دیکھا، وہ آنحضرت کی مثال تھی، آپ کی شخصیت نہیں تھی، تب یہ بحث پیدا ہوگی کہ یہ یا تو آپ کی شخصیت کی مثال ہوگی یا آپ کی حقیقی روح مقدسہ کی جو شکل و صورت کے ملوثات سے پاک ہے، اگر یہ مانا جائے کہ یہ آپ کی مثال شخصیت ہوتی ہے، جو مجموعہ استخوان و لحم ہے، تو پہلو گون کو اسکی کیا ضرورت آپ کا جسد یا شخص بذاتہ مطمح تصور و محسوسات ہے، تب اس سے یہ بات نکلے گی کہ جس شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا، اس نے نبی صلعم کو نہیں دیکھا، بلکہ اس جسد (مطر) کو دیکھا جو آپ کے اشارہ اور ارادہ سے حس و حرکت کیا کرتا تھا، تب وہ شخص جو آپ کی "مثال شخصیت" دیکھتا ہے، کیونکر کہہ سکتا ہے کہ میں نے آنحضرت کو خواب میں دیکھا، حقیقت یہ ہوتی ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ کی "مثال" ہوتی ہے، جو مہبط وحی (الہیہ) ہے اور اسی کو انسان آپ کی روح یا جوہر ذات، یا آپ کی شخصیت (جسد مہبط) خواب میں نظر نہیں آتی، بلکہ فی الحقیقت یہ آپ کی مثال ہوتی ہے، اسوقت یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ تب آپ کی حدیث کا کیا مطلب ہے؟ آپ نے فرمایا جس نے مجھے خواب میں دیکھا درحقیقت اس نے مجھی کو دیکھا کیونکہ شیطان خود کو میرے مثل نہیں بنا سکتا، (امام غزالی) نے وہ حدیث لکھی تھی جسے میں نے اوپر نقل کیا، میکڈونلڈ نے اسی کا ترجمہ کیا ہے) اس کا عقیدہ یہ ہے، کہ خواب دیکھنے والا ایک مثال دیکھتا ہے، جو اسکے اور نبی صلعم کے درمیان میں واسطہ پیدا کرتی ہے اور اسے حق و صداقت کی تعلیم دیتی ہے، جس طرح جوہر نبوت یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مقدسہ جو آپ کی وفات حقیقی کے بعد باقی ہے، اور وہ رنگ، شکل اور صورت سے منزہ ہے، اور پھر بھی لوگوں کو اس سے محض ایک حقیقی مثال کے ذریعہ، جس میں رنگ بھی رہتا ہے اور شکل و صورت بھی رہتی ہے، (آپ کی تلقین و مواعظت کا) علم حاصل ہوتا ہے، حالانکہ جوہر نبوت اس (رنگ شکل و صورت) سے پاک ہے، ٹھیک اسی طرح ذات الہی بھی شکل و صورت کے رسوم و قیود کی حامل نہیں، لیکن ایک مثال محسوسہ کی وساطت سے مخلوقات کو اسکا علم ہوتا ہے، یہ مثال محسوسہ ایک مہبط انوار ہوتی ہے، یا حسن و جمال کا کوئی دوسرا مرقع جسے اس ذات الہی کے پر تو حسن سے تعبیر کر سکتے ہیں جس میں نہ رنگ کی آرائش ہے، نہ شکل و صورت کی قید بند، وہ مثال حقیقی ہوتی ہے، اور حصول علم و معرفت کے درمیان میں واسطہ پیدا کرتی ہے، اسلئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے اللہ جل شانہ، کو خواب میں دیکھا تو اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس نے ذات باری تعالیٰ کو دیکھا جس طرح ایک شخص جو یہ کہتا ہے کہ "اس نے نبی صلعم کو خواب میں دیکھا، تو اس سے ذات اور روح یا شخصیت نبوت مراد نہیں رہا سکتی، بلکہ محض رویت مثال مقصود ہوتی ہے، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر صلعم کا مثل تو ممکن ہے، لیکن خدا کا مثل تو وراح امکان ہے، تو یہاں "مثل" (مکانہ) اور "مثال" (شخصیت)

کے مابہ الامتیاز کے سمجھنے میں غلطی ہوگی۔ مثال اور مثل میں فرق ہے۔ مثل کے لئے ضروری ہے کہ تمام صفات میں مساوات ثابت ہو، اور مثال میں یہ شرط نہیں رہتی، ذقوت ادراک، ایک ایسی چیز ہے کہ اسکا مثل نہیں ہو سکتا۔ ہلوگ اس کے لئے آفتاب کی مثال دے سکتے ہیں، کیونکہ دونو ایک حیثیت سے متشابہ ہیں، آپکی دسات سے ہلوگ محسوسات ظاہرہ کا علم حاصل کرتے ہیں، اور قوت ادراک کی بدولت محسوسات باطنہ کا، مثال کے لئے صرف یہی ایک وجہ تشبیہ کافی ہے، اس سے بھی واضح مثال یوں سمجھنا چاہئے، کہ ایک بادشاہ کو کوئی شخص آفتاب کی شکل میں دیکھے اور وزیر کو چاند کی شکل میں، بادشاہ اور آفتاب، چاند اور وزیر شکل و خیال کے اعتبار سے مساوی نہیں، لیکن وجہ تشبیہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ تمام عالم پر حکمرانی کرتا ہے اور تمام چیزیں اسے زیر اثر ہیں یہی حیثیت آفتاب کی ہے اور جب طرح ایک وزیر، بادشاہ اور اسکی رعایا کے درمیان میں صحیح احکام کے اصدار کے لئے واسطہ رہتا ہے، اسی طرح چاند بھی، آفتاب اور کرۃ ارضی کے درمیان میں، روشنی پہنچانے میں واسطہ رہتا ہے، یہ مثالیں ہیں ”مثل“ نہیں۔

نبی صلعم کے حضور میں لوگوں نے بعض ایسے خواب کا تذکرہ کیا، جس میں دودھ اور رسی کا ذکر تھا آپ نے تعبیر بتائی کہ دودھ سے اسلام مراد ہے، جس طرح دودھ ظاہری زندگی کی غذا ہے، اسی طرح اسلام باطنی زندگی کی، رسی سے قرآن مجید مراد ہے، جس سے ہلوگ سلامتی میں رہتے ہیں، اسی طرح خدا کا بھی ”مساوی“ نہیں لیکن اسکی ”مثالیں“ ہیں، جو اس کے صفات کے ساتھ ذہنی تشابہ رکھتی ہیں، ہلوگ کسی طالب تحقیق کو تعلیم دیتے ہیں کہ خدا کس طرح پیدا کرتا ہے، کس طرح ارادہ کرتا ہے؟ ان تمام مسائل کے لئے ہلوگ ایک انسان کی مثال پیش نظر رکھتے ہیں، اگر انسان (ذات الہی کے ادراک میں) اپنی ہی صفت سے ہوگا، تو وہ خدا کے متعلق بھی مثال نہیں سمجھ سکتا، خدا کے متعلق ایک مثال ممکن ہے، اور اسکا مثل ناممکن، چونکہ مثال سے صرف تصریح و وضاحت ہوتی ہے، لیکن ”مثل“ مشابہ ہوا کرتا ہے۔

لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کچھ تم نے ذکر کیا، اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا ہے کہ خدا کو دیکھ سکتے ہیں بلکہ ان سب باتوں سے صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب میں نظر آنے کا انکار ثابت ہوتا ہے، کیونکہ کسی شے کی مثال کا دیکھنا اس شے کی ذات کا مشاہدہ کرنا نہیں ہے، تب آنحضرت صلعم نے کیونکر یہ فرمایا کہ ”جس نے مجھے خواب میں دیکھا، اُس نے اے بخاری شریف میں حضرت عبداللہ ابن عمر سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں آنحضرت کا خواب میں دودھ دیکھنا مذکور ہے، لیکن اپنے اسکی تعبیر ”علم“ بتائی ہے، فما اولت ذلک یا رسول اللہ قال العلم۔ اسی طرح آپ کے سامنے ایک شخص نے اپنا خواب بیان کیا جس میں شہد رسی، اور گھی کا تذکرہ تھا، حضرت ابو بکر صدیق نے اسکی تعبیر بتائی، اور رسی کو کہا کہ اس سے وہ طریقہ مراد ہے جس پر آنحضرت لوگوں کو چلا رہے ہیں، واما السبب الواصل من السماء الى الارض فالحق الذی انت علیہ۔

مجھے کو دیکھا، (من سرائی فی المنام فقہ سرائی) تو گویا یہ ایک ناجائز تعبیر مجازی ہے، اس مفہوم کی کہ گویا اس نے مجھے کو دیکھا، تب اس کا جواب یہ ہے کہ ٹھیک ہی صورت تو اس وقت بھی پیدا ہوتی ہے، جب ایک شخص یہ کہتا ہو کہ ”میں نے خواب میں خدا کو دیکھا“ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس نے ذات باری تعالیٰ کو دیکھا، کیونکہ یہ مسلمہ نظر یہ ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو نہیں دیکھ سکتے، بلکہ ذات باری تعالیٰ، یا ذات نبوت کی ایک ”مثال“ دیکھ سکتے ہیں، اس قسم کے خواب سے انکار نہیں ہو سکتا، حتیٰ کہ وہ شخص جس نے اس قسم کے خواب نہیں دیکھے اس سے بھی متواتر احادیث کے ذریعہ ماننا پڑے گا، بعض اوقات یہ مثال صادقہ ہوتی ہے، اور بعض اوقات کاذبہ جب صادقہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس رویت ”مثال“ کو خواب دیکھنے والے اور نبی صلعم کے درمیان میں ایک واسطہ بنا دیتا ہے، قدرت الہیہ اس پر حاوی ہے کہ مخلوقات اور اس کے حصول صداقت کے درمیان میں وہ ایک ایسا واسطہ پیدا کر دے۔

امام غزالی کا خواب | میکڈونلڈ نے امام غزالی کے متعلق بھی دو خواب کا تذکرہ کیا ہے، جن میں ایک خود امام غزالی کے الفاظ میں ہے، امام موصوف فرماتے ہیں۔

پہلے میں اولیاء اللہ کے رموز بخود ہی کا منکر تھا، اور مجھے ہندی طریقت کے مدارج ترقی سے بھی انکار تھا، یہاں تک کہ مجھے اپنے شیخ یوسف نساج کا فیض صحبت میسر آیا، شیخ موصوف نے میرے قلب کی جلا کرنی شروع کی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مفاد و ضات کشف دالہام سے مجھے نوازا، میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا اور اس نے کہا ”الی ابو حامد؟“ میں نے کہا کیا شیطان مجھ سے کلام کر رہا ہے، اس نے کہا ”نہیں بلکہ میں ہوں تمہارا خدا کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں (اشارہ ہے قرآن کی آیت کی طرف) تب اس نے کہا الی ابو حامد تم اپنے رسمی ضوابط ترک کرو، اور ان ارباب فوق کا جلس وندم اختیار کرو، جو زمین پر میری عزت کا مستقر ہیں، یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے دو توجہ ان کو میری محبت کے بدل بیچ ڈالا، (عرفی نے اپنی ایک رباعی میں یہی نظریہ پیش کیا ہے) گوید کہ دل و دین فروشید بدرد تب میں عرض کیا یا اللہ تیری قدرت کی قسم، میں تجھ سے التماس کرتا ہوں کہ تو مجھے اُنکے متعلق اچھے خیال کا ذوق عطا کر، اس نے کہا میں قبول کرتا ہوں، تیرا ان سے جدا رہنا، اس بنا پر تھا کہ تو اس عالم فانی کی محبت میں سرشار تھا، اس لئے تو خود، اپنے ارادہ سے اس بند محبت سے آزاد ہو جاتا کہ موت کے

بلکہ امام غزالی نے جو متکلمانہ مباحث کئے ہیں وہ میں میکڈونلڈ کے انگریزی ترجمہ سے لئے ہیں۔ امام غزالی کی بحث ہر چند فلسفیانہ ہے، لیکن یہاں انہوں نے حدیث کی تائید میں جو بحثیں کی ہیں، وہ تشفی بخش معلوم نہیں ہوتیں خصوصاً، جب ”مثال“ الہی یا مثال نبوت کا ذبیہ بھی ہو سکتی ہے تو آخر حدیث کے لفظ فان الشیطان لا یمثل بی کی کیا توجیہ ہو سکتی۔

وقت تجھے زبردستی اس سے جدا کر نیکی ضرورت نہ ہو، میں تجھ پر نزولِ نوار کی بارش کرتا ہوں، اس لئے اسے اسے
اور اوٹھ۔ مستفیض ہو، تب میں بڑی خوشی میں بیدار ہوا، اور اپنے شیخ یوسف نساج کے پاس گیا، اور ان سے اس
خواب کا تذکرہ کیا، وہ مسکرا کر بولے، اے ابو حامد! یہ تفسیر پذیر حالات و مقامات ہملوگون کے نزدیک کوئی وقعت نہیں
رکھتے، اگر تم میری صحبت میں رہو، تو تمہاری نظر باطن منکشف ہو جاوے گی، اور تم عرش اور اس کے ماحول کا مشاہدہ
کرو گے، تمہارے ذوق طلب کی تشنہ کامی ایک صبر آزما شوریدگی تم میں مٹیج رہیگی اور تم اس وقت وہ چیزیں مشاہدہ
کرو گے، جنکی حد کشش تک احساس نظر کی رسائی نہیں، اور تم اپنی کثافت فطریہ سے ایسے پاک و صاف ہو
جاؤ گے، کہ پھر تمہارا گذروہان ہو گا۔ جو تمہاری ادراک کے حدود سے متجاوز ہے، تم موسیٰ کی طرح اللہ جل شانہ
کا کلام منلو گے۔

امریکن اور نیٹل سوسائٹی کے جریدہ جلد ۲۰ میں میکٹرویلڈ نے ابو بکر الشاشی کی مفصلہ ذیل
روایت نقل کی ہے، ابو بکر نے امام غزالی کی وفات کے صرف دو برس کے بعد انتقال کیا، وہ کہتے ہیں
”ہمارے عہد میں ایک شخص تھا جو امام غزالی سے نفرت رکھتا تھا، اور انہیں برا کہتا، اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں
دیکھا، حضرت ابو بکرؓ اور عمرؓ آپ کے پہلو میں تھے، امام غزالی آپ کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے، یا رسول اللہ! یہ
یہ شخص میرے خلاف بولا کرتا ہے، اسپر آنحضرت نے فرمایا کوڑا لاؤ۔ اور امام غزالی کو برا کہنے کی پاداش میں اس
شخص کو کوڑے لگائے گئے، تب وہ آدمی خواب سے بیدار ہوا، اور اسکی پشت پر کوڑے کی علامت باقی تھی، وہ
نالہ و بکا کرتا اور یہ واقعہ کہتا،

ابن خلکان کا خواب | ابن خلکان ایک دینی عالم، ایک فقیہ، ایک نحوی اور ایک ادیب بھی تھے، انھوں نے
۶۸۲ھ میں وفات پائی، اپنی کتاب، دقیات الاعیان میں انھوں نے اپنے ایک
خواب کا تذکرہ کیا ہے، مصنف کے ہات کا لکھا ہوا، دقیات الاعیان کا ایک قلمی نسخہ برٹش عیو زیم میں موجود ہے،
وہ لکھتے ہیں۔

”ایک مرتبہ میں المبرد کو خواب میں دیکھا اور اسکے ساتھ ایک نہایت تعجب انگیز معاملہ ہوا، اسلئے میں اسے
کناجا ہتا ہوں، ۳۶ھ میں، میں اسکندریہ کے اندر تھا، اور وہاں پانچ مہینہ تک مقیم رہا اس وقت المبرد کی کتاب
”کامل“ اور ”عقد“ مصنفہ ابن عبد ربیع میرے پاس تھیں اور میں انکا مطالعہ کر رہا تھا۔“

اسکے بعد علامہ موصوف نے صاحب ”عقد“ اور المبرد کی دوسری کتاب ”روضۃ“ کے متضاد بیان کا
تذکرہ کیا ہے، جو اسکی دلچسپی کا مرکزی نقطہ تھا، اور اسکے بعد کہتے ہیں۔
جب میں ان متضاد بیانات کا مطالعہ کیا، اسکی چند راتیں گزرنے کے بعد میں خواب میں دیکھا کہ جیسے

میں حلقہ کے اندر قاضی بہاؤ الدین معروف بہ شہاد کے مدرسہ عالیہ میں ہوں، جہاں میں طالب علمی کے زمانہ میں رہ چکا تھا، اور دیکھا کہ میں جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھ رہا ہوں، جب میں اپنی نماز ادا کر چکا تو جانے کے لئے اٹھا، لیکن مینے ایک شخص کو گوشہ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، حاضرین میں سے ایک شخص نے مجھ سے کہا یہ المبرود ہے، اسلئے میں اس کے نزدیک گیا، اور اسکی فراغت نماز تک میں منتظر رہا وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو مینے اسے السلام علیک کیا اور کہا میں آجکل آپکی کتاب ”کامل“ کا مطالعہ کر رہا ہوں، وہ بولا کیا تم نے میری کتاب روضہ دیکھی ہے، مینے کہا ”نہیں“، چونکہ مینے اسے اسوقت تک نہیں دیکھا تھا، تب سے کہا آؤ میں تمھیں دکھاؤں، اسلئے میں اس کے ساتھ ہو لیا، اور ہم دونوں اس کے مکان پر آئے اور اندر داخل ہوئے، مینے بہت سی کتابیں دیکھیں، وہ ان کتابوں کے سامنے بیٹھ گیا، اور اپنی کتاب ”روضہ“ تلاش کرنے لگا، میں اس کے سامنے بیٹھا رہا تب اس نے ایک جلد اٹھائی، اور مجھے دی، مینے اسے کھولا، اور اپنے زانو پر چھوڑ دیا، اس کے بعد کہا: ”یہاں آپ پر لوگوں نے کچھ اعتراض کیا ہے، اس نے دریافت کیا وہ کونسا اعتراض ہے، مینے کہا، آپ ابو نو اس کے فلان فلان اشعار پر تنقید کی ہے، اور مینے وہ اشعار اس کے سامنے نقل کئے، اس نے کہا یقیناً وہاں غلطی پائی جاتی ہے، مینے کہا، نہیں، وہ صحت پر تھا، اور لوگوں کا خیال ہے، اس پر تنقید کرنے میں آپ نے غلطی کی ہے، اس نے کہا کیسے؟ اسلئے مینے اس کے سامنے صاحب ”عقد“ کی رائے بیان کی اس نے دانت سے اپنی انگلی دبائی، اور ایک دار فتگی کے عالم میں جیسے گھبرایا ہوا ہوا، تعجب سے میری طرف دیکھتا رہا وہ اسی حالت میں تھا کہ میں خواب سے بیدار ہو گیا۔

ابوریحان البیرونی | میکڈونلڈ کہتا ہے، المبرود نے ۳۵۹ھ میں وفات پائی، ابن خلکان سے تقریباً چار سو برس قبل وہ گذرا ہے، ابن خلکان ایک کامل مسلم شخصیت کی نیابت کرتا ہے، لیکن اگر خیال کیا جائے کہ ایک دینی عالم اور فقیہ پر وہمیت کا اثر ہو سکتا ہے، تو ابوریحان البیرونی کا واقعہ بے یحیٰ جسے ۳۵۹ھ میں وفات پائی، البیرونی قریب قریب یقیناً اپنے زمانہ کا سب سے بڑا حکیم تھا، اس کا دماغ بالکل ناقدانہ واقع ہوا تھا، وہ ایک ہیئت دان تھا، ایک مورخ تھا، اور سنجیدگی کے ساتھ رسم و رواج اور مذہب و ملت کا مطالعہ کیا کرتا، وہ کہتا ہے، میری حیات کے ۶۱ سال کی آخری رات تھی، مینے خواب میں دیکھا کہ طلوع قمر کا مشاہدہ کرنے کے لئے میں افق آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں جہاں اس روز اسے ظاہر ہونا چاہئے تھا مینے ایک آواز سنی، درجاند کو چھوڑ دو، تم ۱۹۰ مرتبہ اس کے بیٹے ہو، اس نے اسکی تعبیر سمجھی کہ میں ابھی ایک سو نوے قمری مہینہ تک در زندہ رہوں گا، میکڈونلڈ کہتا ہے، اس واقعہ سے اسکی مزید تائید ہوتی ہے کہ اسکی اصل زندگی اس حساب سے صرف ایک ہی مہینہ کم واقع ہوئی۔

ناصر خسرو علوی

مذہبی دنیا کی طرف توجہ کیجائے تو ایسے خواب کا پتہ معلوم ہوتا ہے، جسکے باعث ایک شخص نے شعار ملت کے مطابق اپنی زندگی کی اصلاح کی، ناصر خسرو، اپنے سفر نامہ میں خود لکھتا ہے کہ اس ذریعہ سے مینے دنیا سے منہ موڑ لیا، حکومت مرو میں وہ سکرٹری (نظامت) کے عہدہ پر مامور تھا دولت کی فراوانی اور اسکی لذت آگینیاں اسکی رفیق زندگی تھیں وہ ظاہر کرتا ہے، کہ اکتوبر ۱۲۵۰ء میں مجھے موقع ملا کہ اگر مین اسرار نجوم کے مطابق دولت کے لئے خدا سے دعا کروں تو مقبول ہوگی، بظاہر اسکی زندگی انقلاب پذیر نہ معلوم ہوتی تھی، مذہب، نجوم، دنیاوی ہوس اور لذات کے مخلوط اثرات میں وہ مبتلا تھا، ایک شب اسنے خواب میں دیکھا کہ ایک صورت یوں خطاب کر رہی ہے ”کہتے تم شراب پیتے رہو گے، جو انسان کی عقل کھو دیتی ہے، اچھا ہوتا کہ تم اپنے مین آجاتے“ اسنے جواب دیا عقل مندوں نے شراب سے بڑھکر ترددات دنیوی کی زائل کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں پائی، اس شکل نے کہا، عقل کے فقدان اور اپنی ذات پر تصرف نہ رکھنے کی گم گشتگی سے روح کو اطمینان نہیں ہوتا، کوئی عقل مند آدمی کسی کو جنون کی رہنمائیوں کی صلاح نہیں دے سکتا، بلکہ اسکی تلاش ضروری ہے، جس سے عقل بڑھتی ہے، ناصر خسرو نے کہا ”تو مین کیا کروں“ اس صورت نے جواب دیا ”جو بندہ یا بندہ“..... اور مکہ کی طرف اشارہ کیا اس خواب نے ناصر خسرو کی زندگی بدل دی، اسکی نفسیاتی حالت میں کتنی ہی استعداد کیون نہ آگئی ہو، اسکے دماغ کے پیش نظر کوئی ایسا سوال نہ تھا، جسکے ماتحت اسقدر سرعت کیسا تھا اسکی زندگی انقلاب پذیر ہو جاتی، صبح کے وقت اسنے ارادہ راسخ کر لیا، کہ وہ تمام چیزیں ترک کر دے جو پالیس سال تک زندگی سے متعلق رہی تھیں، اسنے سکرٹری کے عہدہ سے استعفا دیدیا، اپنی دولت لٹا دی صرف ضرورت سفر کے مطابق رکھ لی، اور ۶ مارچ ۱۲۵۰ء کو مرد سے بہ ارادہ حج بیت اللہ روانہ ہوا، اسکے بعد اسنے ایک مذہبی سلج کی طرح زندگی گزار دی اور مشنہ میں ایک تارک الدنیا درویش کی طرح بدخشان کے پہاڑ پر مر گیا۔

امام اشعری

اسی قسم کا ایک مذہبی انقلاب علامہ ابوالحسن الاشعری کی زندگی میں بھی واقع ہوا تھا، امام اشعری مسلمانوں میں اشعریہ فرقہ کے بانی گذرے ہیں، انکے مکملانہ افکار و احساسات اور فقیہانہ اجتہاد و نظریات آٹھ سو برس سے اسلامی مذہب میں متداول ہیں، انھوں نے معتزلی فکر و عقیدہ میں نشوونما پائی تھی، معتزلہ وہ ہیں جو عقلی اصول کی بنا پر انکار کرتے ہیں کہ قرآن مجید غیر مخلوق ہے، یہ کہ ایمان والوں کو بہشت کے اندر خدا کا دیدار ہوگا اور یہ کہ مخلوقات کے تمام اعمال کا خالق خدا ہے، عموماً ان لوگوں نے الہیات میں بحث و تمحیص کی، اور اہل سنت و الجماعت کی طرح انھوں نے آبائی معتقدات کا تتبع کرنا نہ چاہا جو قرآن مجید کے نظریات اور آن حضرت صلعم کے ذاتی کلمات مواعظ پر مبنی تھے۔

امام اشعری نے معتزلہ کی طرح نشوونما اور تربیت پائی تھی، اور چالیس برس کی عمر تک آپ نے آباء مسلک کے مطابق بحث و جدل بھی کرتے رہے، میکڈونلڈ لکھتا ہے کہ امام اشعری چونکہ سامی الاصل (Semitic) تھے اسلئے انکی حیات شاعرہ ایک سیدھے سادے نصیحت آمیز عقیدہ کی خواہان تھی، اس وجہ سے وہ اپنے مسلک کے ارباب فکر کی منطقیانہ سخن پر دازیوں سے دل میں اکتانگے تھے،

مطالعہ نتیجہ سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سمجھ رہے تھے، (گو انکا یہ ادراک انکی سطح شعور سے فروتر تھا) کہ ایک خالص عقلی علم کلام بیکار ہے، اور یہ کہ انسانی خیال میں اسرار کائنات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی انکے نفس باطن میں یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ ”اس طرح خدا کہتا ہے“ کی بلا واسطہ صدقہ سن لین، جو قرائع خاطر کا سبب ہوا وہ روحانی انقلاب پذیری کی رزمگاہ میں تھے، کہ ماہ رمضان کے ایک دن جب انہیں ضائمانہ اور متعبدانہ انہماک تھا، خواب کے اندر ایک سرور شغیب آیا، میکڈونلڈ کہتا ہے، یہ قصہ مختلف طریقوں سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن میں یہاں اسپٹیا کی کتاب ”سیرت ابوالحسن الاشعری“ سے یہ روایت نقل کرتا ہوں، جو نفسیاتی اعتبار سے زیادہ قابل توجہ ہے، یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایک معتزلی کی حیثیت سے ابوالحسن الاشعری کے نزدیک خواب کی کوئی اہمیت نہ تھی، پھر بھی یہ تعجب انگیز امر ہے کہ انکی فکر و احساس نے خواب کی صورت اختیار کر لی۔

امام اشعری فرماتے ہیں۔

”ایک دن جب کہ میں ماہ رمضان کے پہلے عشرہ میں سویا ہوا تھا، مینے آن حضرت صلعم کو خواب میں دیکھا آپ نے فرمایا۔ الی علی! تم میری حدیث کی تائید کرو، کیونکہ وہ صحیح ہے، پھر جب میں بیدار ہوا، مجھے نہایت مصیبت معلوم ہوئی، اور میں برابر خیالات اور اندیشہ میں پڑا رہا، چونکہ ان مسائل (حدیث) کے متضاد پہلوؤں کے متعلق براہین ساطعہ میرے پیش نظر تھے، آخر کار دوسرے عشرہ میں بھی مینے ایک رات آن حضرت صلعم کو خواب میں دیکھا، آپ نے فرمایا تم نے اسکے متعلق کیا کیا جسکے بارہ میں مینے تمہیں حکم دیا تھا مینے کہا یا رسول اللہ! میں کیوں کروں؟ آپ کی حدیث سے مینے ایسے ایسے مسائل استنباط کئے، جنکے متعلق الہیاتی استدالات نے قوتوائے جواز دیا، اور مینے اس صحیح سند کی پیروی کی جو خالق پر مجموعی حیثیت سے منطبق ہو سکتی تھی، تب آپ نے فرمایا، میری حدیث کی تائید کرو، چونکہ وہ صحیح ہے، میں حزن و ملال کی گرائی کے ساتھ بیدار ہوا، اور ارادہ کر لیا کہ متکلمانہ استدالات ترک کروں گا، مینے احادیث نبوی، کا مطالعہ اور تلاوت قرآن مجید شروع کر دی،

اسکے بعد جب (رمضان کی) سٹائیسوین تاریخ آئی جس رات میں میرا دستور تھا کہ میں تہرہ میں علما، صلحا، اور حفاظ قرآن مجید کے ساتھ شبینہ پڑھا کرتا تھا، حسب دستور میں اس جماعت کے ساتھ تھا لیکن مجھ پر نیند کا

ایسا غلبہ ہوا، کہ میں قیام نہ کر سکا، اور جب میں گھر آیا، سو رہا، اس رات کے قیام اور تلاوت کے ترک ہو جانیکا مجھے سخت صدمہ تھا، میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، آپ نے فرمایا تم نے اس کے متعلق کیا کیا جسکے بارہ میں میں نے تمہیں حکم دیا تھا، میں نے کہا، میں نے الہیاتی استدلال ترک کر دیے اور تلاوت قرآن مجید، اور آپ کے اقوال و سنن کی روایات کا مطالعہ شروع کر دیا، لکن آپ نے فرمایا کیا میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ الہیاتی مباحث ترک کر دو، میں نے تمہیں صرف یہ حکم دیا تھا کہ تم میری احادیث کی تائید کرو، چونکہ وہ صحیح ہیں، تب میں نے کہا یا رسول اللہ میں کیونکر ان مسائل کی تائید کروں جن کے عناصر میں نے بوضاحت سمجھے ہیں، اور جنکا ثبوت اس میں برس تک میں نے خواب سے زیادہ نہیں تصور کیا، آپ نے فرمایا اگر میں یہ نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ تم پر خاص نظر رحمت موفوف کرے گا تو میں جب تک ان پیچیدہ مقامات کی توضیح نہ کر دیتا، تمہارے نزدیک سے نہ ہٹتا، اور تم جب میرا یہ آنا محض خواب (و خیال) تصور کرتے ہو، تو مجھ پر حضرت جبریل کا آنا بھی خواب (و خیال) تھا؟ اسکے بعد تم اس طریقہ سے مجھے نہ دیکھو گے اسلئے تم اس امر میں مشغول ہو جاؤ، خدا کی طرف سے تمہاری خاص مدد ہوگی، تب میں خواب سے بیدار ہوا، اور میں نے کہا صداقت کے لئے جستجو مشروط ہے، اسکے بعد میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان احادیث کی تائید و توثیق شروع کی جو خواب، مداخلت نبوی، اور روایت الہی کے متعلق ہیں اسکے بعد قسم خدا کی میرے دماغ میں ایسی ایسی باتیں آنا شروع ہوئیں جنکا تذکرہ نہ کبھی میرے مخالفین نے کیا تھا، اور نہ جنکے مباحث میں کسی کتاب میں دیکھے تھے، اسلئے میں یہ سمجھا، کہ یہ وہی تائید الہی ہے جسکے متعلق ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی تھی۔

اس خواب کو نقل کر کے میکڈونلڈ لکھتا ہے، کہ امام اشعری نے سچ مچ یہ خواب دیکھا تھا، اسکے متعلق شبہ نہیں، کیونکہ اسکے بعد انکی زندگی میں انقلاب رونما ہوا، اور وہ معتزلی عقاید ترک کر کے اہل سنت و جماعت میں داخل ہو گئے، امام اشعری آئے تو علم کلام بھی ساتھ لائے جسکا وجود صرف معتزلہ کی جماعت میں تھا امام اشعری کے قبل اہل سنت و جماعت میں متکلمانہ ذوق مفقود تھا، یہ اسلام کی مذہبی تاریخ کا ایک انقلابی دور تھا، اسوقت سے اہل سنت و جماعت نے اپنے عقاید کی تائید میں صرف احادیث ہی سے مدد نہیں لی بلکہ اس میں قیاس و رائے بھی شامل کر لیا، یہ واقعہ تیسری صدی ہجری میں واقع ہوا،

میکڈونلڈ نے اسکے بعد برٹن کے سفرنامہ سے ایک پنجابی کے خواب کی روایت نقل کی ہے جس نے حضرت علیؑ کو خواب میں دیکھا تھا اور حج کے لئے چلا گیا، برٹن اپنی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں اس پنجابی سے خود مکہ معظمہ میں ملا تھا، چونکہ اس نے اس خواب کا تاریک پہلو پیش کیا ہے، جو عصبیت سے ملوث معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں اسے نظر انداز کرتا ہوں، جن ارباب ذوق کو دلچسپی ہو وہ میکڈونلڈ کی کتاب کا مطالعہ کریں۔

”در خواب میں تعلق“ ”غیر مشہود“ کے باب کو میکڈونلڈ مفصلہ ذیل تہہ کے بعد ختم کرتا ہے، وہ کہتا ہے، کہ اسلامی جماعت کا ہر رکن خواہ وہ اہل سنت و الجماعت سے تعلق رکھتا ہو، یا ارباب کفر و الحاد کے زمرہ سے خواہ وہ علماء دین کے مشرب سے وابستہ ہو یا فلاسفہ کے مسلک سے، خواب کے اوپر ایمان رکھتا ہے، اسکے بعد لکھتا ہے کہ اہل اسلام میں خواب کے متعلق ایک کتاب ہے، جو ہر چند اپنی مختلف النوع مرکزیت دلچسپی، اور مصنف کے موضوعانہ طریق نقش طرازی، اسکی سیرو سیاحت اور تاریخ عصری کا مرقع ہونیکی حیثیت سے، اسقدر مشہور نہیں ہے، حالانکہ اسے مشہور ہونا چاہئے..... یہ کتاب ابن بطوطہ کی زندگی اور اسکا سفر نامہ ہے جسے اسنے ۳۵۵ھ میں بمقام فیض پیش کیا اسے مصنف نے ۲۸ سال کے سفر سے واپس آنے، اور تقریباً ۷۰ ہزار میل کی رہ نوردی کرنے کے بعد لکھا ہے، سینگوینیٹی اور ڈفرامیری نے اس کتاب کا اصل عربی نسخہ عمدہ فریج ترجمہ کے ساتھ شایع کیا۔

باقی — باقی

”عبدالملک آروی“

تذکرہ خندہ گل

یا ظریف شاعر کا تذکرہ

جس میں ۳۰۰ سے زائد اردو، فارسی کے ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطائف و ظرائف اور انتخابات کلام درج ہیں۔ یہ کتاب اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل چھوٹی چیز ہے اور ہر صاحب ذوق کی لائبریری میں اسکا رہنا ضروری ہے۔ تنہائی میں اس سے بہترین نمونے، نمکینی میں اس سے زیادہ کامیابی، تفریح اور اہل تحقیق کے لئے اس سے زیادہ مواد اس موضوع پر اور کہیں نہیں مل سکتا۔ حجم تقریباً ۵۰ صفحات قیمت معنہ

محصول ڈاک للعد (چار روپیہ)

”مینجر نگار لکھنؤ“

وعدہ شکن

(سرزمین چین کی ایک عبرتناک لڑائی)

— (۱) —

سلطنت کوریاء (چین) کے گوشے گوشے میں چودانگ کی محبت پرستی کا شہرہ پہنچ گیا تھا۔ اور اس کی پاک اور حقیقی محبت لوگوں کے لئے ایک عجیب اور نادر مثال بن گئی تھی۔ چودانگ حسن و جمال میں بھی نہایت ممتاز تھا اور حکمت پر بھی کامل دسترس رکھتا تھا۔ قسمت سے اسے بیوی بھی نہایت شریف اور نیک طینت اور پاک باطن ملی تھی۔ اور وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اپنی وفا شعار می، اور شوہر پرستی میں یکتائے زمانہ تھی۔ دنیا ان کی محبت پر شک کرنے لگی تھی۔

چودانگ جب کہیں سیر و تفریح کو جاتا تو ہانسی کو بھی اپنے ساتھ لیجاتا۔ اور ہانسی کی تمام خوشیوں اور مسرتوں میں چودانگ اسکا ہم جہیز رہا کرتا۔ جب وہ کسی جلسے یا دعوت میں شریک ہوتے تو دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رہتے۔ اور انبساط و سکون ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا۔ جب وہ گفتگو کرتے تو ان کی زبان سے ایک ہی قسم کے الفاظ نکلتے۔

وہ محبت گئے راز ہائے پنہان اور رموز مخفی سے بھی بخوبی آشنا ہو گئے تھے۔ اور کسی کو کبھی یہ خیال بھی نہو سکتا تھا کہ ان کے ان سکون میں کوئی چیز خلل انداز ہو سکتی ہے۔

(۲)

کے نام ہر طرف سکوت چھایا تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں چھپتے جا رہے تھے اور ہر طرف اس وقت سناٹا طاری تھا۔ شہر سے باہر ایک قبرستان میں انتہائی خاموشی حکمران تھی۔ اور اس عالم سکوت میں اور ایسے بھیاںک مقام پر، ایک عورت سفید لباس میں ملفوف، ایک بہت بڑا پنکھا اپنے سر میں تازک ہاتھوں میں لئے ہوئے، ایک قبر پر جھلنے میں مصروف تھی۔ اور کسی خیال میں یکسر محو تھی۔ اس کا چہرہ نہایت دلکش اور خوبصورت تھا اور شباب کی رعنائیاں اس کے عضو عضو سے جھلک رہی تھیں وہ اس لباس میں ایک حور خیال سے کم نہ نظر آتی تھی۔ تاہم وہ کسی قدر بچپن اور بیقرار تھی۔ وہ بار بار اپنا چہرہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی۔ آہ سرد بھرتی اور پھر خاموش ہو جاتی اور پنکھا جھلنے لگتی۔

اس اثناء میں قبرستان کی چار دیواری کے قریب ایک انسانی شکل متحرک نظر آئی۔ وہ بدستور حرکت کرتی ہی

پھر چند منٹ تک ایک مقام پر ٹھہر گئی۔ اور پھر متحرک ہوئی اور آخر اس عورت کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ عورت نے پُر اربان نکاہوں سے آئینو اے کی طرف دیکھا۔ اور پھر سر جھٹکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ آئینو اے شخص اس عورت کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا۔ اور ایسا معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے پھر کچھ دیر کے بعد وہ چوٹکا۔ اور اس نے نہایت جرات کر کے اس جوان عورت سے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”تم یہاں کیوں کھڑی ہو اور اس قبر پر نیکھا جھلنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“

عورت نے غلغلیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈب رہے تھے“ مہربان اس ہمدردی کا شکریہ تیر دل سے ادا کرتی ہوں۔ لیکن آپ پوچھ کر کیا کریں گے۔“

چو دانگ بولا: ”مگر آپ کو بتانے میں کیوں عذر ہے امین اس لئے دریافت کر رہا ہوں کہ شاید آپ کی دگر سکو“ عورت نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ”وآہ افسوس اب دنیا میں مجھے ایسا شوہر کہاں ملے گا جو اس قبر میں رحمت ابدی کی نیند سوراہا ہے۔ میرا پیارا شوہر، ایک نہایت رحمدل، اور نیک خصلت انسان تھا۔ مرتے وقت اس نے مجھے کہا تھا کہ جب تک اس کی قبر کی مٹی خشک نہ ہو جائے۔ اس وقت تک میں دوسری شادی نہ کروں۔ اس وقت آپ مجھے اسی حکم کی تکمیل میں سہمک دیکھ رہے ہیں۔“

چو دانگ نے پوچھا: ”بان مٹی تو ضرور خشک ہو جائیگی مگر نیکھا جھلنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟“ عورت نے جواب دیا: ”اس لئے کہ مٹی جلد سوکھ جائے۔ اس کام میں میں نے دو دن صرف کر دیئے ہیں اور یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس وعدہ کی تکمیل نہ ہو جائے دوسری شادی نہ کروں گی۔ خواہ اس قبر کے سوکھنے میں اور چار دن کیوں نہ لگ جائیں۔“

چو دانگ، بیوہ کے حسن سے متاثر ہو چکا تھا۔ اور اب تک نہایت سنجیدگی اور احترام کے ساتھ اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ مگر بیوہ کے اس عجکت، کے خیال سے وہ مسکرا دیا۔ تاہم فوراً ضبط کر کے اس نے نہایت ہمدردی کے انداز سے کہا۔ ”محترمہ۔ اگر آپ میری ناچیز بات کو نگاہ مشکوک سے نہ دیکھیں۔ تو میں یہ عرض کر دینگا کہ میرے عزیز کدے پر تشریف لے چلے۔ میری بیوی آپ کو دیکھ کر بہت مسرور ہوگی اور آپ کی تشفی اور دلدادگی کی کریگی۔“

عورت نے شرمیلی انداز سے جواب دیا: ”مہربان آپ کی اس عنایت کی ممنون ہوں۔ میں آپ کے اس جذبہ ہمدردی کو احترام کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ مجھے آپ کی شرافت پر کامل اطمینان ہے اور چلنے میں کوئی عذر نہیں۔“

(۳۴)

آئینو اپنی خلوت گاہ میں ایک مسہری پر دراز تھی۔ سر ہانے ایک چھوٹی خوبصورت مینر پر ایک شمع جھلک کر رہی تھی اور وہ کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی۔

چودانگ کرہ میں داخل ہوا۔ اور آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچ گیا۔ ہانسی اُسے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چوہ ڈال کے برابر بیٹھ گیا اور بولا: پیاری ہانسی ایک بات کہنے آیا ہوں۔ سنو گی اور میرا کہنا مانو گی۔“

ہانسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: ”تمہاری بات سننے سے پہلا مجھے عذر ہو سکتا ہے اور میں نے تم سے انکار کس بات میں کیا ہے؟“

چودانگ نے کہا: پیاری ہانسی۔ آج اتفاقاً میں قبرستان چلا گیا تھا وہاں ایک بیوہ عورت کو غمگین حالت دیکھ کر میں بے حد متاثر ہو گیا ہوں۔

ہانسی نے قدرے عجیب ہو کر پوچھا: کس بات سے؟

چودانگ نے جواب دیا: اس کا شوہر مر گیا ہے اور مرتے وقت اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ جب تک اسکی قبر کی مٹی خشک نہ ہو جائے وہ دوسری شادی نہ کرے۔ چنانچہ وہ بیوہ پر شکھ جھل کر سٹی خشک کر رہی تھی اُسے میں اپنے گھرے آیا ہوں۔ تم اس کی تسلی اور تسکین کرو۔ یہ ایک انسانی ہمدردی ہے، مگر ہانسی —

ہانسی اب تک چپ چاپ سن رہی تھی اور دل ہی دل میں اس عورت کو کوس رہی تھی۔ مگر اس نے عجیب ہو کر پوچھا: کیوں چپ ہو گئے۔ پیارے چودانگ کہو نا کیا مجھے کوئی بات چھپائی ہو۔

چودانگ بولا: نہیں ہانسی تم سے کون راز پوشیدہ ہیں۔ ہاں میں کچھ کہنے والا تھا۔ مگر شاید تمہیں ناگوار گزلیے

ہانسی نے کہا: نہیں تمہاری کوئی بات مجھے ناگوار نہ گذریگی۔ تم شوق سے کہو۔

چودانگ نے کہا: میرا یہ خیال ہے کہ اگر میرا بھی یہی انجام ہوا تو شاید تم بھی اسی بیوہ کی طرح کرو۔

ہانسی یہ سن کر بے ساختہ رو پڑی۔ اس کے تمام جسم میں لرزش پیدا ہو گئی۔ وہ ہمہ تن غصہ ہو گئی۔ اس نے برہم ہو کر ہون سے چودانگ کو گھور کر دیکھا۔ اور بولی: ”چودانگ۔ چودانگ تم نے مجھے کیوں ایسا سمجھ لیا ہے۔ آہ مجھے تو تم سے ایسی بدگمانی کی کبھی بھی امید نہ تھی۔“

چودانگ نے تسلی دیتے ہوئے کہا: پیاری ہانسی تم غصہ ہو گئیں۔ میں نے صرف اپنا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ تمہیں اس سے صدمہ پہنچا۔ پیاری ہانسی معاف کر دو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تمہیں اس سے کوئی تکلیف نہو گی

ہانسی نے اشک آلود نگاہوں سے دیکھ کر جواب دیا: چودانگ ان الفاظ سے تم نے میرے قلب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے ہیں اب کس دل سے تم سے بات کر دوں۔ آہ تم کس قدر ظالم ہو کہ بلا کسی وجہ کے ایسا فضول خیال قائم کر لیا۔ چودانگ میں اور میری جان صرف تمہارے لئے ہیں میں کسی دوسرے سے محبت نہیں کر سکتی چودانگ۔ میری باتوں کو دل پر نقش کر لو۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں۔

چودانگ نے متاثر ہو کر کہا: ہانسی پیاری ہانسی مجھے تمہاری طرف سے ذرا بھی بدگمانی نہیں معلوم نہیں کیوں

یہ خیال آگیا تھا۔ اور میں چونکہ اپنے دل کی کوئی بات تم سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نے اسکا بھی اظہار کر دیا مگر خیراب اسے درگزر کرو۔ پیاری ہانسی چودا انگ تم سے معافی مانگتا ہے۔

ہانسی نے جواب دیا:۔ میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جہاں ایسی بے وفا اور بیشرم عورت ہوگی میں ایک لمحے وہاں ٹھہرنا گوارا نہ کروں گی۔ اُسے ابھی نکال دو۔ اس کی وجہ سے میرا گھر ناپاک ہو جائے گا۔ چودا انگ نے کہا:۔ اچھا تم اس قدر ناراض ہو اس قدر برہم ہو۔ پیاری ہانسی میں کبھی تمہاری دشمنی گوارا نہیں کر سکتا۔ میں ابھی اُسے نکال دیتا ہوں۔ پیاری ہانسی میری پیاری، اُدو یہ کہہ کر اس نے ہانسی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

— (۴) —

رات نہایت طوفانی اور سرد تھی۔ آندھی بہت زور شور سے چل رہی تھی۔ اور رات زیادہ بھیانگ ہو گئی تھی۔ پیاری بیوہ عورت، چپ چاپ گھر سے نکلی اور تاریکی میں کسی طرف روپوش ہو گئی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا دروازہ کھٹکھٹانیکی آواز آئی۔ دروازہ کھولا گیا۔ چودا انگ کا ایک شاگرد جسے چودا انگ نے بہت عرصہ سے نہ دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوا۔ دو نوں اس کے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور نہایت فرزندہ روی اور زندہ دلی سے پیش آئے۔ سب لوگ گفتگو میں مشغول ہو گئے۔

ایک نہایت بڑے اور آراستہ کمرے میں فرش بچھایا گیا مختلف قسم کے کھانے و ستر خوان پر چنے گئے۔ اس وقت چودا انگ اور ہانسی کے اندازہ و اطوار سے اطمینان قلب، نشاط و بہجت کے آثار ہویدائے تھے۔ اور ان کے اس اتحاد کی مسترت ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

یہ ایک چودا انگ بیٹھے بیٹھے زمین پر گر پڑا۔ اور بیہوش ہو گیا۔ اور اس کے قلب کی حرکت بند ہو گئی تمام لوگ یہ منظر جانگداز دیکھ کر بہت مضطرب اور پریشان ہو گئے۔ کوئی ادھر دوڑنے لگا کوئی ادھر۔ کوئی ڈاکٹر کو بلانے گیا کوئی پکھا پھیلنے لگا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں ہر شخص بدحواس ہو گیا۔ اور چودا انگ کو ہوش میں لانے کی ہمدردی کی جانے لگیں۔ بچہ دوا دوش اور کوششوں کے بعد بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا۔ اور سب نے چودا انگ کو مردہ سمجھ لیا۔ شوہر پرست ہانسی پر اس صدمہ کا نگاہ سے ایک بجلی سی گر پڑی اور وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر گر پڑی۔ بہت دیر تک اُس پر پڑی رہی۔

— (۵) —

شاگرد، اپنے استاد کی اس اچانک موت سے بہت سراپیمہ اور غمزدہ ہو گیا اُسے کسی کل چین نہ آتا تھا۔ ہانسی شاگرد کی اس حالت کو دیکھ کر بہت متفکر ہو گئی اور آخر کار چودا انگ سے وفا شعاری کا وعدہ اس نے فراموش کر دیا بیوہ عورت کی حالت بھی اس کے دماغ سے محو ہو گئی۔ اور اب وہ شاگرد کی بچپنی کو رفع کرنے میں سراپا محو ہو گئی۔

ایک دن گذر گیا۔ دوسرے دن وہ شاگرد سے نہایت دلچسپ گفتگو کر کے اس کی تسلی اور تسفی کرتی رہی۔ گفتگو میں اس قدر آزادی اور غریانی خیال موجود ہوتی تھی کہ دونوں کے جذبات میں ایک ہل چل سی پچ جاتی تھی۔ تیسرے دن دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنے پر رضامند ہو گئے۔

(۶)

چودانگ کی آرام گاہ اس وقت غم و آلام کے آثار سے معرا تھی۔ مسرت کی رنگینیاں بہار کی طرح ساری فضا پر چھائی تھیں۔ نشاط و فرحت کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ چودانگ کی نقش ایک تابوت کے سپرد کر کے ایک تنہا کمرہ میں رکھ دی گئی تاکہ جب تک عدالت سے دفن کر دینا حکم نہ ملے۔ وہاں محفوظ پڑی رہے۔

دولہا اور دولہن نے نہایت بیش قیمت، زرین اور لباس فاخرہ زیب تن کئے۔ ہانسی نے ناک میں ایک بیش قیمت بلاق پہنا۔ اور نوشہ نے مرحوم استاد کے ملبوس سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ عقد کا وقت قریب آ گیا۔ تمام خاندان اس آئینہ مسرت سے نہایت مسرور اور شاد نظر آ رہا تھا اور تمام کمرے۔ برآمدے۔ اور دالان روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ عطر و عنبہ کی خوشبوؤں سے فضا معطر ہو رہی تھی۔

اس وقت ہانسی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک نہایت آراستہ خلو تکدے میں، تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اپنے نوجوان شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی عالم فرحت و ہجت میں ایک ملازم نہایت متوحش اور مضطرب کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

درہمارا۔ نوجوان آقا۔ اچانک۔ ایک سخت مرض۔ میں۔ مبتلا ہو گیا۔ ہے۔ مرض تنہا خطرناک ہے۔ جب تک۔ کسی مردہ۔ انسان کا دل۔ اس کے سینے۔ پر نہ رکھا جائے اس۔ کی زندگی کی کوئی۔ امید نہیں۔

ان الفاظ کو سنتے ہی ہانسی و فور غم سے تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی اس کی روح کو شکنجے میں کس رہا ہو۔ اس کے منہ میں اور حسین چہرے پر اضطراب کی لہرین سیلاب کی طرح دوڑنے لگیں وہ دیوانی سی ہو گئی۔ تاہم اُس نے جلد جلد اپنے لیے جوڑے اور زمین پر گھسٹنے والے کپڑوں کو میٹا۔ وہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں گئی ایک کلباڑی لی۔ اور دوڑ کر اس کمرے میں جا پہنچی۔ جہاں اس کے شوہر کی نقش پڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مردہ شوہر کا دل نکال کر زندہ شوہر کی روح کو موت کے چنگل سے چھڑا دے۔ وہ اس خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُسے انجام کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔ وہ زور زور سے کلباڑی صندوق پر مارنے لگی۔ چند منٹوں کے بعد صندوق ٹوٹ گیا۔ اور ساتھ ہی چودانگ کی نقش حرکت کرنے لگی۔ جیسے تمام لوگوں نے مردہ سمجھ لیا تھا۔

اس ہستناک منظر سے خوفزدہ ہو کر ہانسی نے کھڑی چھوڑ دی۔ اس کا تمام جسم اور جسم کار ونگٹار ونگٹا خوف سے
تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ اس منظر کو زیادہ نہ دیکھ سکی اور ہان سے بھاگ آئی۔

(۷)

چودانگک صندوق سے باہر نکل آیا۔ اور اپنی بیوی کی اس غیر معمولی آرائش اور اسکی پریشانی دیکھ کر سخت
متحیر ہوا۔ وہ کچھ دیر تک ساکت رہا۔ لیکن جب ہانسی وہاں سے چلی گئی تو وہ وہاں سے نکل کر باہر آیا۔ تاکہ اس
آرائش کا سبب دریافت کرے۔ اُسے وہاں کوئی نہ ملا وہ آگے بڑھا۔ اس اثناء میں دو ملازم داخل ہوئے اور
اور انھوں نے چودانگک کو دیکھ کر بھاگنا چاہا۔ چودانگک نے ان کو پکارا۔ اور وجہ دریافت کی۔ لوگوں نے اُسے
بہت دیر کے بعد زندہ سمجھا اور گزشتہ واقعات بلا کم و کاست بیان کر دیئے۔

چودانگک کو ملازمن کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ وہ اپنی بیوی کے متعلق ایسی باتیں سن کر بہت برہم ہوا اور
ملازمن کو برا بھلا کہہ کر خود ہی ہانسی کو تلاش کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان تمام واقعات کی حقیقت سے آشنا ہو
وہ چاہتا تھا کہ ہانسی کے متعلق لوگوں کے بیانات غلط ثابت ہوں۔ اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر یہ تمام واقعات
سچ ہوں تو وفا شعار ہانسی سے اُس کی وعدہ شکنی کا تذکرہ کر کے اُس پر اظہارِ نفرت کرے۔

(۸)

ہانسی، نفس پرست اور وعدہ شکن ہانسی بدنامی اور رسوائی کے خوف سے لرز گئی۔ اس کے لئے دنیا میں
اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت نہ ہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے عزیز شوہر سے وعدہ شکنی کی تھی۔
چودانگک دھراؤ دھرتلاش کرتا رہا۔ اور آخر کار پھر اُسی کمرے میں جا پہنچا جہاں اسکا تابوت رکھا تھا۔
اس نے دیکھا اور دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے دیکھا اور اپنا دل تھام کر رہ گیا۔ ہانسی نے ذلت، ندامت اور بیوفائی
کا صدمہ نہ برداشت کر کے خودکشی کر لی تھی۔

چودانگک ایک فلسفی تھا۔ وہ نہایت عمیق نظر اور نکتہ رس اور دانشمند تھا۔ اُس نے یہ سب دیکھا
اُس نے اپنی مونس زندگی، اپنی رفیقہ حیات اور محبوبہ و نواز کو خاک و خون میں آلودہ دیکھا۔ لیکن اس کی
زبان سے اُف تک نہ نکلا۔ وہ جون کاٹون کھڑا رہا۔ اور واقعات پر غور کرنے لگا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ
اگر اس وقت اور کوئی شخص ہوتا تو رو دیتا۔ لیکن چودانگک اپنی ذات کو اس کمزوری سے افضل اور برتر
سمجھتا تھا۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔ کچھ دیر گزر گئی۔ اس کی باریک بین نگاہوں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ سائے
رازی کے بعد دیگرے اس پر منکشف ہو گئے۔ اور اُس نے پُرانے تابوت کو درست کر کے اُس میں اپنی وعدہ شکن
بیوی کی نعش رکھ دی۔

— (۹) —

چو دانگ پھر خاموش ہو گیا۔ اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ اٹھا۔ اس کے دماغ میں کوئی مفید تدبیر آگئی تھی۔ اس نے تمام آرائش اور ساز و سامان کو اسی حالت میں رکھ کر اس بکھے والی بیوہ عورت کو تلاش کیا اور اپنے گھر لے آیا۔ چونکہ دو نون ایک دوسرے کی قطرت اور اخلاق کی کمزوری سے واقف ہو چکے تھے اس لئے وہ شادی کے بعد ایک دوسرے کی غلطی معاف کرنے اور عیوب سے چشم پوشی کرنے کے رموز سے بھی آشنا بن گئے تھے۔

خشر عابدی

(گولڈ اسٹمپ)

علم الکیمیا کا ایک حیرت انگیز تجربہ کا یا پلٹ ہیرا ایل

کہنے کو صرف یہ تیل ہے لیکن اپنے اثرات کے لحاظ سے کسیر کو بھی بات کرتا ہے۔ یہ تیل نہایت قیمتی اور نادر الوجود بنانا کی کیمیاوی اجزاء سے جدید اصول پر تیار کیا گیا جسکی تصدیق بڑے بڑے سائنس دانوں کی ہے اسکے فوائد کی تفصیل مختصر شہادین نامکن ہے مختصر اویں سمجھ لیجئے کہ گہرین اسکی ایک شیشی کھنڈا کو باہر سے مہر فرس کو فغ کر دیتا ہے۔ رہتا ہے اور تمام اثرات نزلہ کو خواہ سر میں ہو یا دانتوں یا مسٹوھوین بکلیاں در کر دیتا ہے۔ (۱) سر اور جسم کے پھیڑیاں بھنسیاں، گرمی دنانے، خارش اور ہر طرح کے جلدی امراض اسکے مالش سے فوراً ہو جاتے ہیں۔ ایک تازہ شعلیت ملا جلتا ہو۔ مکرری تسلیم

آپ کا عنایت کردہ تیل بہت مفید ثابت ہوا ابھی ایک شیشی ختم نہیں ہوئی ہے اور سر کی خشکی جاتی رہی بال گرنا بند اور نئے بال نکلنے شروع ہو گئے۔ براہ کرم حکم دیدیجئے کہ ایک شیشی در بھی جائے اور آئندہ بغیر میری ہتدعا کے ہر مہینے کے شروع میں ایک شیشی بذریعہ وی پی روانہ ہوا کرے واسلام۔

نیا زمند جعفر علی خان (ڈپٹی کلکٹر) رائے بریلی۔

جوانی امور کے واسطے جوانی کا ریڈیاٹکٹ آنا ضروری ہے قیمت محض (۱۰۰)

(۲) شدت تپ کی حالت میں اسکی مالش فوراً ہڈیاں حالت کو دور کر کے پسینہ آتی ہے اور بخار کو کم کر دیتی ہے۔

(۳) ایسے مہلک امراض سے جیسے کنٹھ، لالہ، دل دق، اسکا استعمال کرنیوالا محفوظ

مینجر کا یا پلٹ ہیرا ایل۔ لکھنؤ

ہماری قدیم فسانہ نگاری

اور

فسانہ عجائب کے اجزائے ترکیبی

جہاں تک خیال کیا جاتا ہے۔ اور مشہور ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین نے نثر و نظم میں اپنے بیان کے بالکمالوں کے ذراوی شاہکار پیش کئے۔ اور آج تک تقاضا اور ناز کے ساتھ ہی دونوں پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک ان میں سے مرزا رجب علی بیگ کا ”فسانہ عجائب“ ہے۔ اور دوسرا منشی دیا شنکر نسیم کی ”گلزار نسیم“۔

گلزار نسیم ایک شاہکار ادب سی۔ ایک عجوبہ روزگار ثنوی سی مگر اس حقیقت کو کوئی طاقت نہیں چھپا سکتی کہ وہ صرف ایک شراب کہنہ ہے جسکو دوا آتشہ کر دیا گیا ہے جیسا کہ خود اس کا مصنف کہتا ہے۔

وہ نثر تھی داد نظم دون میں اس نے کو دوا آتشہ کروں میں

یعنی قصہ پرانا تھا اب اسکو نظم کر دیا گیا ہے۔ بعض مضمون نگاروں نے اس طرف توجہ کی ہے کہ آیا وہ جسکو دوا آتشہ کیا گیا ہے وہ اپنی ہی آگ سے دوا آتشہ کی گئی ہے یا اس کے لئے بھی حرارت کا کہین اور سے دست نگر ہونا پڑا ہے۔ چنانچہ اس میں بھی تحقیق کے بعد بہت بڑا شک پڑ جاتا ہے۔ کہ یہ دوا آتشہ خود مصنف کی گرمی سخن کی کہان تک رہیں منت ہے۔ بعض ستم ظریفوں نے فارسی کے مصرع کے مصرع سامنے رکھ دئے ہیں۔ اور بنا دیا ہے کہ نسیم کی کاوش نمائش کی منزل سے آگے نہیں بڑھتی۔ بہتوں نے اور ذرا عنایت کی ہے انھوں نے اسکو آتش کے دل و دماغ کا نتیجہ بتایا ہے۔ اور اگر بڑھنے والے زیادہ قدم اٹھاتے ہوئے اس راہ میں بڑھ گئے ہیں اور ثنوی بدر میر سے اسکا تقابل کر دیا ہے تو پھر ایک قیامت ہی آگئی ہے ان قضیوں کے دیکھنے والے کو سوائے ”وائے برجان سخن“ کہنے کے اور کچھ بن ہی نہیں پڑتا۔

یہ ہے اب اس گلزار نسیم کا حال، جو ہمیشہ میدان ادب میں اہل من مبارز کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔

فسانہ عجائب ایک ایسی چیز ہے جس پر شاید کوئی اعتراضی داغ اب تک نہیں پڑا ہے۔ اور جسکے جواب میں سروس سخن کو ہمیشہ نقش ثانی سمجھا گیا ہے۔

اس فسانہ کی بدلی سحر کاری، شاید تین چار حیثیتیں رکھتی ہے۔ یعنی یہ کہ ادسکی نثر مقفی ہے۔ دلکش ہے اور اپنے وقت کا ادبی معجزہ ہے۔

دوسرے یہ کہ سرور نے فسانہ عجائب کا قصہ بالکل طبعاً لکھا ہے اور صرف اپنی کوشش و کاوش کو اہل دماغ کے سامنے پیش کر کے اپنی جودت طبع کا شیدائنا دیا ہے۔

کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ فسانہ عجائب کی گفتگو خاص قلعہ معلیٰ یا بیگمات کی گفتگو ہے۔ اور یہ عقیدہ ہندو عام ہے کہ ایمان بالغیب کی حد تک پہنچ گیا ہے۔

یون تو سرا سران دعا دی کی تلمذ یب نہیں کیجی سکتی۔ مگر پھر بھی بہت سے شکوک اور اوہام کی اس میں گنجائش ہے۔ اور پھر بہت سے شکوک حد شک سے گزر کر یقین کی حد تک پہنچتے ہیں۔ چنانچہ ہم فسانہ عجائب کی ان چاروں حیثیتوں پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں۔ اور بتانا چاہتے ہیں کہ گویا ہر پرست سلسلی نظروں کے سامنے وہ معجزہ ادب ہو۔ سحر نگاری ہو۔ یا رعبہ ادب ہو مگر غائر نگاہوں کے سامنے یہ دعویٰ ع و شیطانی بود و زرش ایمان بالغیب اسے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا۔ سب سے پہلے ہم بتانا چاہتے ہیں کہ فسانہ عجائب قصہ کے لحاظ سے کیا حیثیت رکھتا ہے۔

ہمارے یہاں کے قدیم افسانوں کی ابتدا کے لئے تین چار مضامین سنگ بنیاد قرار پا گئے ہیں اور غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ کدوکاوش کے باوجود بھی ادبی سیاحت ان طلسمی مضامین کے جنگل سے باہر قدم نہیں رکھ سکے۔ وہ لاکھ لاکھ تجربہ کار ہوئے اونکی گرم رفتاری کسی حد پر پہنچی۔ مگر ہر پھر کر آخر کار دائرہ ہی میں قدم رکھا۔

یہ کچھ شرطی قرار پا گئی ہے۔ ایک واجب سی بات پھر گئی ہے کہ مہتمم بالشان قصہ کے لئے کسی ذی مرتبہ ہستی کو انتخاب کیا جائے جس کا درجہ زیادہ سے زیادہ شاہ جنات تک پہنچتا ہے اور ادنیٰ سے ادنیٰ ہو تو کوئی نواب یا امیر ویراس سے کم کے لئے ایشیائی افسانہ نگاری میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ اگر الف لیلہ کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو قریب قریب یہ بات ایک کلیۃً قرار پا جائیگی کہ گویا غریب اور ادنیٰ درجہ اور طبقہ کے لوگوں میں کوئی ایسا واقعہ کبھی پیش ہی نہیں آتا جس کو افسانہ کے طریق پر لوگوں کو سنا سکیں۔ قصہ نویوں داستان گو یوں۔ قدیمی افسانہ نگاروں کے نزدیک گویا ادنیٰ اور غربا کی زندگی ایک سادہ ورق ہے جس پر کسی واقعہ کا وہ بتا پڑا ہی نہیں۔ نظم و نثر دونوں اصناف کے قصے ایسے ہی ہیں۔ چنانچہ نظم میں گلزار نسیم، مثنوی قلق، مثنوی زر جعفری، مثنوی ماہ پیکر، مثنوی بحر البیان، قصہ سیاہ پوش، مثنوی شیرین خسرو، مثنوی نلدن، مثنوی پدماوت، مثنوی شوق قدوائی، مثنوی موجدہ غم، مثنوی یوسف زلیخا، مثنوی گلشن عشق، مثنوی جوہر عشق، مثنوی دریائے عشق وغیرہ وغیرہ اور نثر میں قصہ ممتاز، داستان امیر حمزہ، حاتم طائی، باغ و بہار، گل و ضویر، بلکہ الف لیلہ، بوستان خیال، سروش سخن، قصہ سیاہ پوش۔

وغیرہ وغیرہ سب اسی دائرہ میں ہیں۔ سب کی ابتدا بادشاہوں اور امیروں کے آوارہ مزاج صاحبزادوں سے ہوتی ہے۔ یا خود اوہان مزاج حکمران کی سیاہ کاریوں سے افسانوں کے کاغذ کو رنگا گیا ہے۔ یہ ہم نہیں کہتے کہ ان سب کا راستہ ایک ہے اور ایک ہی داستان ان سب میں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جہان سے چلے ہیں وہ جگہ ایک ہی ہے۔ اسی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ سرور کے داغ نے کوئی نئی بات نہیں کہی بلکہ وہ بھی اُسی آموختہ کو دہراتے رہے۔ جو استاد ازل نے انکو سکھا دیا تھا۔ انکو بھی سوائے بادشاہ کے اور کوئی ایسا نہ ملا جس سے وہ اپنے قصہ کی ابتدا کرتے۔ اسکی نظیر میں ہتے متعدد قصے پیش کئے ہیں۔ لہذا ان کے قصہ میں کوئی ندرت برائے نام بھی نہیں ہے۔

اسکے بعد دوسری منزل آتی ہے۔ عموماً ایشیائی قصوں کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے کہ کسی بادشاہ کے لڑکا پیدا ہوا۔ تمام اسباب شاہی ہیج نظر آنے لگے۔ دولت و حشمت میوہ ہو گئی۔ آخر بادشاہ سلامت ماروس ہوئے۔ دحشت نے زیادہ زور کیا تو وہ ترک شاہی کا ارادہ کر بیٹھے اور اگر خلل و داغ اس درجہ پر نہ ہو چکا تو خیر کھر گوشہ گیری اور عزت اختیار کر لی۔ بعد خرابی بصرہ صاحبزادے یا شاہزادے صاحب پید ہوئے تو دیوانہ و مجنون نے رسوا سر بازار سے کی صحیح مثال۔ اور حماقت کی مجسم تصویر۔ چنانچہ سرور نے بھی یہی کیا اور یہ خیال شبنوی میر حسن۔ یا باغ و بہار سے لے لیا۔

اسکے بعد تیسری منزل آتی ہے جس میں صاحبزادے یا شہزادے کو عشق پیدا ہوتا ہے مگر اسکے لئے بھی چند مخصوص ذرائع ہوتے ہیں۔ کسی کی طبیعت بیٹھے بیٹھے اگتاتی ہے بیچ و تاب کھا کر شیدائے محض بنکر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ فیضی نے راجہ نل کو اسی حال میں پھنسا یا ہے۔ دوسرا ذریعہ قبول خاطر و لطف سخن خداداد کی بموجب خواب ہے۔ یہ جواب بھی ایک بلائے بد ہے۔ عموماً اسکی تعبیر آئندہ چلکر صحرانوردی اور جنون۔ غربت ہو کر رہتا ہے۔ اس خیال کی ابتداء یوسف زلیخا کے قصے سے ہوئی ہے اور پھر لوگوں نے اس سے استعارہ جائز و ناجائز فائدے اٹھائے کہ آج بہت سی داستانیں اس سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ تیسرا دام فریب تصویر ہے۔ جسکے ذریعہ سے ظاہر دل شکار کئے جاتے ہیں۔ چوتھا حیلہ نظارہ محض یا نظارہ لبام ہے اس کے ذریعہ سے بھی بہت سے عشاق طائر بسمل کی طرح رقص بسمل کرائے جاتے ہیں۔

ان سب کے بعد افسانہ نو بیوں کی تدبیر کی ترقی اس درجہ پر پہنچتی ہے کہ بادشاہ کے گھر میں لڑکا پیدا ہوتا ہے اور جوان ہو کر اتفاق سے سیر بازار کو جاتا ہے کوئی طوطا خریدتا ہے۔ اور اس طوطے سے کسی حسن جاسوز کا افسانہ عشق شکر مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فسانہ عجائب میں بھی یہی کہا گیا ہے جان عالم نے طوطا خریدا ہے اور اس کے بعد ہی اسکو جلا وطنی نصیب ہوئی۔ یہ ایک پامال خیال ہے اسکو ہرگز سرور کے

دماغ کی پیداوار نہیں کہا جاسکتا۔ اصل میں یہ خیال پرمادیت۔ یا بہار دانش سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ پرمادیت میں راجہ رتن سین۔ اور بہار دانش میں بہرہ ور بانو کے عشق میں شاہزادہ جہاندار شاہ طوطے ہی کی بدولت مبتلا ہوا اور پھر سفر کی بہت سی مصیبتیں اٹھائی ہیں۔

جیسے جہان عالم کے ساتھ یہ طوطا کیا ہے اسی طرح جہاندار شاہ کے ساتھ بھی طوطا ہر ایک سفر میں رہا ہے اور اسی واسطے اس خیال کو مصنف بہار دانش کے دل و دماغ کا نتیجہ کہا جائے گا۔

جہان عالم چلتے چلتے ایک جنگل میں پہونچا جو نہایت ہی پر فضا تھا۔ وہاں اسکو دو بہرن نظر آئے۔ اور جہان عالم اونکو دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ وزیر زادے سے کہا کہ کسی طرح انکو جیتا گرفتار کیجئے۔ بہرن ان دونوں کو اپنے ورپے دیکھ کر دوڑے۔ آگے چل کر وہ بہرن ایک دوسرے سے جدا ہو گئے اور بادشاہزادہ اور وزیر زادہ یمن سے علیحدہ ہو کر گمراہ ہوئے

یہ خیال بظاہر مصنف فسانہ عجائب کا پیدا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر جب باغ و بہار میں تیسرے درویش کی سیر پر نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال وہاں سے لیا گیا ہے۔ باغ و بہار میں یہ ذکر تیسرے درویش کی سیر میں اس طرح کیا گیا ہے کہ تیسرا درویش عجم کا شاہزادہ ہے۔ ایک روز یہ شکار کے لئے گیا تو بالکل ایسے ہی جنگل میں پہونچ گیا جیسے جنگل میں جان عالم پہونچا ہے۔ وہاں اسکو ایک کالا بہرن نظر آیا، جو طرح طرح کے نفیس سامانوں سے بجا ہوا تھا۔ اور اس جنگل میں جہان خود رو بہرے اور پھولوں کی کمی نہ تھی چرتا پھرتا تھا۔ شاہزادہ عجم کو شوق ہوا کہ کسی طرح اس کو زندہ گرفتار کیا جائے اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ تم ہمیں لٹرو۔ میں اس کو زندہ گرفتار کروں گا چنانچہ اس نے اس بہرن کے پیچھے گھوڑا دوڑایا۔ اور آخر گمراہ ہو گیا بہرن غائب ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد جہان عالم کو۔ اور ایک سخت ہولناک جنگل میں پہونچا یا گیا ہے اور وہاں اسکو ایک چشمہ آب نظر آیا ہے۔ یہ خیال بھی باغ و بہار سے لیا گیا ہے اُس نے بھی اپنے شاہزادہ کو چشمہ پر پہونچایا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ اُس نے ایک باغ میں یہ چشمہ دیکھا ہے اور جان عالم نے جنگل میں۔

اس کے بعد ایشیائی مذاق قصہ گوئی کے موافق کسی پیر مرد کا ملنا ضرور تھا۔ چنانچہ شاہزادہ جہان عالم کو ایک پیر مرد ملا ہے جس نے اس پر ترس کھا کر راستہ بھی بتایا ہے۔ اور ایک نظر ملک زنگار کو (جہان جہان عالم کی محبوبہ) آجس آ رہی تھی) بھی دکھا دیا ہے اس کے بعد پیر مرد نے اسکو سٹلا دیا ہے۔ اور صبح کو جب اسکی آنکھ کھلی ہے تو وہ اُسی جگہ آ پہونچا ہے جہان سے بہرن کے پیچھے اُس نے گھوڑا دوڑایا تھا

یہ خیال بھی باغ و بہار کا ہے چنانچہ شاہزادہ عجم کو بھی ایک پیر مرد ملا ہے۔ اور اُس نے بھی ازراہ مہمان نوازی جان عالم کو کچھ ماحضر کھلایا ہے۔ شاہزادہ سو گیا ہے اور آنکھ کھلنے پر اسکو بھی اپنے سوا اوس لان میں

کوئی نظر نہیں آیا۔ اس واقعہ کے بعد مصنف فسانہ عجائب باغ و بہار کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور دوسرے راستہ پر چلنے لگتا ہے۔ یعنی جانتا ہے کہ اُس جگہ پر آیا جہاں سے اُس نے گھوڑا دوڑایا تھا۔ تو وہ از سر نو سرگرم سفر ہوا۔ اور پھر ایک روز تازت آفتاب کی شدت سے گھبرا کر ایک روز ایک حوض پر پہنچا۔ اُس حوض میں اسکو انجمن آرا کی شکل نظر آئی اور اُسی میں کود پڑا۔

کسی پر تعجب اور سخت سے سخت جگہ پر پہنچا نا ایشیائی مضمفون کا خاص شیوہ ہے۔ چنانچہ مصنف بہار و نش نے جہاندار شاہ کو ایک آب ناپید کنار پر پہنچایا ہے۔ اور وہاں وہ ایک درویش کی مدد سے عبور کر سکے ہیں۔ اسی صورت سے دوسرے مصنفین نے بھی یہ سخت مناظر دکھائے ہیں۔ مگر یہ چشمہ اور اس میں کودنا ایک حد تک کسی خاص دماغ کی کاوش کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ دماغ سرور کا دماغ نہیں ہے۔ بلکہ یہ خیال پہلے مصنف فصۃ حاتم طائی کے دماغ میں پیدا ہوا ہے۔ چنانچہ حاتم طائی جب نیر شامی کی امداد کرنے اور حسن بانو کے سوالوں کے جوابات دینے کی غرض سے روانہ ہوا ہے اور پہلے سوال (ایکبار دیکھا ہے پھر دیکھنے کی ہوس ہے) کے جواب کیلئے سرگردان اور پریشان ہے تو ایک ہرے بھرے جنگل میں پہنچا ہے وہاں سو گیا ہے اور وہیں ایک آدمی سے اسکی ملاقات ہوئی ہے اُس نے راستہ بتایا ہے اور حاتم ایک دشت ہو لناک میں پہنچا ہے تو وہاں اسکو ایک تالاب ملا ہے۔ حاتم اس تالاب کے کنارے بیٹھا ہے اس تالاب میں اسکو ایک حسین عورت نظر آئی ہے جو بالکل برہنہ تھی وہ حاتم کا ہاتھ پکڑ کر اُس تالاب میں کود گئی ہے۔ جب حاتم تہ پہنچا ہے اور اسکی آنکھ کھلی ہے تو اُس نے اپنے آپ کو ایک مکلف مکان میں پایا ہے۔ جہاں لاکھوں طرح کی تصویریں دیواروں پر لگی تھیں۔ وہاں اسکو ایک خوبصورت عورت ملی ہے۔ اور اُسی نے لات مار کر حاتم کو دشت ہوید امین پہنچایا ہے۔ کسی ذی وقار با اختیار عورت کے ملنے تک مصنف فسانہ عجائب مصنف آرائش محفل کا ہم خیال رہا ہے۔ مگر اس کے ملنے کے بعد اُس کا خیال بدل گیا ہے اور یہیں سے اُس نے فصۃ حاتم طائی سے قطع نظر کی ہے۔

جان عالم ایک جادوگر نی کے دام فریب میں پھنسا ہے۔ اور اسکو اسکی ہم جنسی اور مصیبتی کی تکالیف سے دوچار ہونا پڑا ہے اُس نے جاہا کہ کسی صورت سے اس مصیبت سے نجات مل جائے۔ مگر وہ ناکام رہا۔ یہ خیال بھی ایک عام اور پامال خیال ہے مشرقی قصہ نویسوں کا ایک خاص رنگ ہے کہ وہ اپنے ہیرو کو ضرور اس قسم کی مصیبت سے دوچار کراتے ہیں اور ضرور ایسی جگہ پہنچاتے ہیں جہاں اسکو کوئی مصنوعی معشوق ملتا ہے۔ یہ بھی عام دستور ہے کہ ہیرو سے کوئی جوان یا ستر برس کی بڑھیا محبت کرتی ہے اور ہیرو التفات نہیں کرتا۔ چنانچہ میر حسن کے مصنف نے یہی کہا ہے۔ بینظیر کا فرخ پری کے یہاں پہنچا اور اُس کا اسکی خاطر تواضع میں محبت کے مارے آنکھیں بچھا دینا۔ اور میان بینظیر کا متوجہ نہ ہونا بالکل ایسا ہی واقعہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ

فرخ بنظیر کو اُسکے کوٹھے پر سے اڑا کر لائی تھی اور یہاں جانے عالم قریب قریب اپنے پاؤں سے اپنی قبر میں پہنچے ہیں۔ اگرچہ بہت ممکن ہے کہ سرور کے دماغ نے یہیں سے فائدہ اٹھایا ہو۔ مگر اس داستان کا اصلی فائدہ لکھنؤ کے ایک دوسرے مشہور مصنف یعنی امانت نے اندر سبھا کے لئے اٹھایا۔ وہ بھی شاہزادہ گلہام کو صاف کوٹھے سے اڑائے گئے اور دیو سیاح کی بدولت اسکو سبز پری کے جال میں پھنسا دیا۔ جہاں غریب گلہام کو اپنی تنہائی پر آنسو بہاتے ہوئے یہ شعر پڑھنا پڑے کہ۔

جیف صد حیف کسی نے نہ خبر لی میری کیا عزیزوں نے مرے دسے بھلایا مجھکو
نہند سے آنکھ کسی کی نہ کھلی کوٹھے پر اٹھ کے موذی کے نہ چنگل سے چھڑایا مجھکو

اگر ہم اس بات کو نظر انداز کر دیں کہ سرور نے تنہا میر حسن سے یہ واقعہ نہیں لیا تو ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ کل وضویر سے ضرور مدد لی گئی ہے۔ شمشاد لعل پوش کا ساتواں لڑکا الماس روح بخش جب مہرا نیکنر اور دل آرام کے پاس سے رخصت ہو کر چلا ہے تو اسکو بھی حسب معمول ایک پیر روشن ضمیر نے راستہ بتایا ہے۔ مگر وہ بد قسمتی سے ایک باغ میں پہنچا پھر لطیفہ بانو جادو گرنی کے قبضہ میں گیا ہے۔ اور جب اُس نے لطیفہ بانو سے رخصت چاہی ہے تو ایک معجون کھلا دیا گیا ہے اسکے بعد ایک لکڑی سانپ کی صورت کی شاہزادے کے مونڈھے پر ماری جس سے مسحور ہو کر وہ ہرن کی صورت بن گیا ہے۔

کہنے والا اگر یقین کے ساتھ نہیں تو گمان غالب کے ساتھ یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ یہ مضمون وہیں سے لیا گیا ہے اور اگر یہ نہیں تو یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ یہ خیال بھی پہلے سے موجود تھا سرور کے دماغ نے کوئی نئی بات نہیں نکالی ہے۔ ہیرو کو بلا میں پھنسانے کے بعد مصنفین کو اس وجہ سے کہ قصہ جاری رہے فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اس دام بکاس صاحب قصہ کو رہائی دلائی جائے۔ مگر الفاظ کی زبردست اور غیر متزلزل زنجیروں میں وہ پہلے ہی سے جکڑا ہوا ہوتا ہے اس واسطے اُس کا چہرانا بغیر کسی زبردست غیبی امداد کے دشوار ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک مقام ہے جہاں قصہ نویس کے دماغ کو اختراع اور ابداع کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے طریقہ مختلف رکھے گئے ہیں۔ کہیں کوئی پیر مرد بصورت اصلی نمودار ہو جاتے ہیں۔ اور کہیں خواب میں جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ کہیں کوئی عمل بتاتے ہیں۔ کہیں اسم اعظم سکھاتے ہیں۔ کہیں نقش سلیمانی مل جاتا ہے۔ کہیں اس جادو گرنی کے والدین کو خبر ہو جاتی ہے غرض کہ اسی قسم کے مافوق الفطرت اتفاقات واقع ہوتے ہیں اور وہ اسپر دام بلا اس سے رہائی پا جاتا ہے سرور نے بھی اس دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھا اور اس ترکیب سے شاہزادہ کو چھڑا دیا کہ ایک روز اس خیال سے کہ مبادا کوئی اور جادو گرنی جانے عالم کو لے اڑے ایک تعویذ سلیمانی اسکو دیدیا۔

میر حسن کو بھی یہ موقع پیش آیا ہے لیکن انھوں نے بنظیر کو ایک کاٹ کا کل دار گھوڑا دلو کر اسکو رہائی سے

قرب کر دیا ہے۔ پھر اُسے ایک اندھے کنوین مین قید کر کے فرخ کے باپ کو خبر ہونے کے ڈر سے شاہزادہ کو رہائی دلا دی ہے اسکے بعد وہ مقام آتا ہے جہاں جان عالم ملکہ مہر نگار کے باغ میں پہونچا ہے۔ اور ملکہ سے اسکی ملاقات ہوئی ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ اس میں افسانہ نویس کو کوئی وقت اور کاوش اٹھانا پڑے۔ مگر اکثر ہوتا یہی ہے کہ بعد اس دام بلا اور مصیبت کے رہائی و آبسائش کا منظر بھی دکھایا جاتا ہے۔ اور کوئی مونس یا رفیق پیدا کیا جاتا ہے۔ چنانچہ تاج الملوک جب گل بکاؤلی لیے لیا ہے راستہ میں اسکی ملاقات حمالہ کی لڑکی اور دبیر بیسوا سے ہوئی۔ اور ان دونوں سے وہ وہ کام نکلے جن سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

اسی طرح قصہ گل و ضوبر میں شاہزادہ الماس روح بخش کو جھیلہ بانو ملی ہے اور اسکی توجہ سے شاہزادے نے رہائی بھی پائی ہے اور اپنے مقصود میں کامیاب بھی ہوا ہے۔

بوستان خیال میں اس خیال کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔ بیسویں جگہ عورتوں نے مردوں کی اسی صورت سے مدد کی ہے۔ داستان امیر حمزہ میں بھی بار بار اس خیال کا اعادہ اور اس مضمون کی تکرار کی گئی ہے۔ اسی طرح آدائش محفل میں بھی جا بجایہ مضمون ملتا ہے۔

ملکہ مہر نگار سے ملنے کے بعد جان عالم کو ملکہ مہر نگار کے باپ سے ملایا جاتا ہے۔ اور وہ ایک لوح عنایت فرماتے ہیں جو دراصل فتح و ظفر کی کنجی اور تمام آفات الارضی و سماوی کی سپر ہے۔ یہ لوح ایک ایسی عام چیز ہے کہ اکثر طلسم پو اور رہنوردان غربت کو مل ہی جاتی ہے اور حقیقت حال یہ ہے کہ اسکے بغیر کام چلنا دشوار ہے۔ بوستان خیال میں جا بجایہ لوح نے مشکل کشائی کی ہے اور دوسرے طلسمی کتابوں میں ہی لوح آڑے آئی ہے

اسکے بعد جان عالم انجمن آرا کے شہر زرنگار میں پہونچتا ہے۔ اور وہاں پونچکر لوح کی مدد سے اسکو جادوگر کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے۔ اور اسکے گھر پر آجاتا ہے۔ اسی طرح سے جا بجایہ لوح کی بدولت فتوحات کثیرہ میسر ہوئی ہیں اور یونہی بہت سے آوارگان غربت کی مجبورہ بلاؤں میں پھنسی ہوئی ملتی ہیں۔ چنانچہ داستان امیر حمزہ۔ اور بوستان خیال میں برابر انھیں کافر جراثیوں کے طلسم ہیں داستان امیر حمزہ سے میری مراد وہ داستان ہے جو فارسی میں تھی اور جو فسانہ عجائب سے بہت پہلے موجود تھی۔

اسکے بعد انجام کار میں وہی شادی کندی انجمن آرا کی ہے جو ہونا چاہئے تھی اسکے لئے کوئی مثال متعین کرنا فضول ہے۔ لب لباب اور خلاصہ تمام مصائب غربت کا یہی ہے اور اکثر ایشیائی قصوں کی یہیں آکر تان ٹوٹی ہے۔ مگر اس مسلمہ قاعدہ کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے کر دہ مسئلہ ہے کہ دولہا اور دولہن کو کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا جاتا۔ اور آسمان کو انکا دشمن کر کے برابر اونکے اوپر بلاؤں کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ مصنف فسانہ عجائب نے بھی وہی کیا ہے پہلے انجمن آرا کی شادی کرائی ہے اور اسکے بعد تاج الملوک پھول لینے کے بعد محمودہ۔ اور

دلبر بیوا کو اپنے حوالہ نکاح میں لایا ہے اسی طرح میان جان عالم نے بھی اپنی رفیقہ قدیم - مہر نگار سے شادی کر لی ہے۔ سب سے بڑا کارنامہ اس داستان کے بعد شروع ہوتا ہے اور بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ سرور کے دلغ نے ایجاد و اختراع سے کام لیا ہے۔ یعنی یہ کہ وزیر زادے نے شہزادہ جان عالم کو وغادی ہے شہزادہ بندر بنا ہے۔ وزیر زادے نے اپنے قالب کو چھوڑ کر شہزادے کے قالب میں حلول کیا ہے مگر یہ بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ابن نشاطی دکنی کی کتاب موسوم بہ مثنوی بھول بن ترجمہ سیاتین فارسی اسی الٹ پھیر پر مبنی ہے اور اسی وجہ سے ایک نقاد نے یہ فقرہ لکھا ہے کہ عجب نہیں فسانہ عجائب سی کو دیکھ کر لکھی گئی ہو۔ اس کتاب میں تمام تر ایک قالب سے دوسرے قالب میں روح کے لیجانے کا بیان ہے۔ سرور کے یہاں قصہ کا بڑا دار و مدار اسی ایک عنوان پر ہے۔

اسکے علاوہ الف لیلہ جو ایک قدیم کتاب ہے اس میں اس قسم کے قصے موجود ہیں کہ آدمی بکری وغیرہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ ابتدا ہی میں سوداگر اور جن کا قصہ اس قسم کا لکھا گیا ہے کہ میں بڑھون نے اپنے قصے بیان کر کے بڑھے سوداگر کی خطا جن سے معاف کرائی ہے انہ وغیرہ کا قصہ بھی ایسا ہی ہے۔ غرض کہ تبدیل قالب کا جادو بھی مدتوں سے ایشیائی قصہ نگاروں میں پھیلا ہوا ہے۔ اور داستانوں کی داستانیں اسی سے بھری ہیں۔ کسی خاص شخص کی دماغی پیدوار نہیں ٹھہر سکتی۔ اور اسکی ایجاد کا سہرا بھی سرور کے سر نہیں رہتا۔

جان عالم کا بندر کے قالب کو چھوڑ کر طوطے کے قالب میں آنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ انسان کے قالب کو چھوڑ کر بندر کے قالب میں آنا۔ اور یہ تو ایک مشہور بات ہے کہ بہت سے لوگوں کی پُرانی کہانیوں میں طوطے کے قالب میں روح پائی جاتی ہے۔

اسی طرح وزیر زادے کا بکری کے بچہ کے قالب میں آنا۔ اور پھر جان عالم کا توتے کے قالب کو چھوڑ کر انسان بنانا یہ سب اسی تبدیل قالب والے جادو کے توابعات میں سے ہیں۔

اسکے بعد جب جان عالم معہ انجمن آرا و مہر نگار تشریف لیچے ہیں تو اسی جادو گرنی نے اپنی بد معاشیان شروع کی ہیں اور تمام لشکر کو نصف تھکر کا بنا دیا ہے۔ یہ نصف تھکر کے جسم کا معاملہ اتنا عام ہے کہ اسکے لئے کچھ لکھنا بیکار ہے۔ بیماری بکا دلی بھی مدتوں راجہ اندر کی بد دعا سے گلزارہ نسیم میں نصف تھکر کی بنی ہوئی سٹھ کے اندر بند رہی ہے۔ اور اس نے بھی برسوں اسی طرح دنیا کی ہوا کھائی ہے۔ اور سیکڑوں اسیران بلا کو یہ واقعہ پیش آیا ہے جسے اکثر لوگ جانتے ہیں انکا لکھنا بیکار ہے۔ مگر ہاں نصف جسم کے تھکر ہونے کے بعد ہی ہمیشہ کسی مشکل کشا کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی واسطے یہاں ملکہ مہر نگار کے والد کو جادو گر سے لڑنے کی صورت پیش آئی۔ اور کسی نہ کسی طرح قضیہ کا انفصال ہوا۔ لڑائی میں بھی وہی تبدیل قالب کا قصہ ہے۔ یعنی جادو گرنی شیرنی بنی۔ اور ملکہ مہر نگار کے والد شیر بنے یہ لڑائیاں سیکڑوں جبکہ فلسفی قصوں میں ملتی ہیں اور اس لحاظ سے ان میں کوئی ندرت نہیں ہے جنگ کے بعد جیسا کہ دستور ہے

ریختی گوئی کا موجد کون تھا؟

ریختی کی ایجاد کا سہرا تمام تذکرہ نویسوں نے سعادت یار خان رنگین کے سر باندھا ہے مولانا محمد حسین آزاد فرماتے ہیں
 ”ریختی کا شوخ رنگ سعادت خان رنگین کا ایجاد ہے“
 (آب حیات)

اور ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔
 ”اس دور میں میان رنگین سب سے نئے کلدستے بنا کر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی
 ریختے سے ریختی نکالی“
 (آب حیات)

خود رنگین نے اپنے دیوان ریختی کے دیباچے میں۔
 ”گندہ بر وزہ با خشکہ خوردن ہر چند گندہ مگر ایجاد پندہ“
 لکھ کر ریختی گوئی کو خود اپنے آپ سے نسبت دی ہے اور نہ صرف یہی بلکہ انشاء پر حملے بھی کرتے ہوئے اسی کا ادعا
 ہے کہ:-
 ریختی کہنی اچی رنگین کا یہ ایجاد ہے منہ چڑھاتا ہے مولا انشا جیا کس واسطے

زبس ہے ریختی ایجاد رنگین اسی باعث کھا کرتا تھا اکثر
 مولا انشا بھی اب کہنے لگا ہے
 مولانا عبدالحی مرحوم فرماتے ہیں:-
 ”شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ رنگین کی طبیعت ایجاد پسند واقع ہوئی تھی اسی بنا پر ریختہ
 سے ریختی نکالی جس کو ان کے لنگوٹے یار میر انشاء اللہ خان نے چمکا دیا اور لکھنؤ میں یہ رنگ
 خوب مقبول ہوا“
 (گل رعنا صفحہ ۶۶)

مولانا عبد السلام ندوی فرماتے ہیں:-
 ”اس سے بڑھ کر یہ کہ اسی زمانے میں سعادت یار خان رنگین نے جنکو اکثر پردہ نشین عورتوں کی
 صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا تھا، ریختی نکالی اور ایک مستقل دیوان عورتوں کی زبان میں مرتب کیا“
 (شعر الہند جلد اول صفحہ ۸۸)

قادر بخش، صابر، وغیرہ رنگین کو ریختی کا موجد نہیں تصور کرتے بلکہ انشاء اللہ خان انشاء کو یہ اعزاز دیا جاتا ہے

البتہ رنگین مشربنائے جاتے ہیں مگر خود انشا لکھتے ہیں:-

”اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہاسپ کا بیٹا انوائی رختی آیکو جانتا ہے رنگین تخلص ہے ایک قصہ لکھا ہے اسی شنوی کا نام و لپنیر رکھا ہے، رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے میر حسن پر زہر کھایا ہے ہر چند اس مرحوم کو بھی شعور نہ تھا ”بدر منیر“ کی شنوی نہیں لکھی گو یا سانڈے کا تیل جیتے ہیں، بھلا اس کو شعر کیونکر کہئے، سارے لوگ دلی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لیکر مرد تک پڑھتے ہیں“

جلی وان سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے کو کڑے سے جباتی ہو ی
”سو اس بیچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے کوئی پوچھے۔ بھائی! تیرا باپ رسالہ اسلم لیکن بیچارہ برچھی بھانے کا رکھنے والا تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا، اور شہدین جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو رختی کے تئیں چھوڑ کر ایک رختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ پہلے آدمیوں کی ہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں، بھلا یہ کلام ہے۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے“ (دریائے لطافت)

مگر مولانا عبدالحی نے ہاشمی بیجا پوری کو رختی گو اور انکی یوسف زلیخا کو رختی قرار دیا ہے اور خاکی کے دو شعر نقل کر کے اسکی رختی گوئی کا ثبوت بھی دیا ہے۔ مولانا نے ہاشمی کے ہندی آمیز اشعار کو رختی تصور فرمایا ہے اور اسی طرح خاکی کے اشعار کو بھی۔ خاکی کے جس دیوان کا حوالہ مولانا نے اپنے تذکرہ میں دیا ہے وہ ہماری نظر سے گزر چکا ہے جس میں باوجود تلاش کے ہمیں کوئی شعر رختی کا نہ ملا بلکہ ہندی آمیز شعر اکثر ہیں، جن پر مولانا کو رختی کا دھوکا ہوا۔ مولانا عبد السلام ندوی بھی ہمارے ہم خیال ہیں وہ لکھتے ہیں کہ:-

”ہمارے نزدیک میر خسرو کے زمانے سے لیکر قیدیا کے دور تک کے جو اشعار ان تذکرہ نویسوں نے

نقل کئے ہیں انکو رختی نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ہندی شاعری کے طرز و روش پر کئے گئے ہیں جس میں

عورت کو عاشق اور مرد کو معشوق قرار دیا گیا ہے“ (شعر الہند جلد دوم بیان رختی)

انہیں پر نظر کر کے ہم نے بھی اپنے مضمون ”رختی اور رنگین“، مطبوعہ رسالہ قوس قزح، لاہور (سالنامہ ۱۳۲۷ء) میں رنگین

ہی کو رختی کا موجد قرار دیا تھا مگر محمد صدیق قیس کے کلیات کے مطالعہ کے بعد ہمیں اپنی رائے بدلتی پڑی۔

قیس جبر آباد کے مشہور شاعر ہیں تاریخ ”گلزار آصفیہ“ میں انکا تذکرہ اس طرح آیا ہے کہ:-

”محمد صدیق قیس ہمیشہ زاوہ شیر محمد خان ایمان تخلص شعر نازک و دلپسند یوضع خواجہ میر

درد و میر تقی میر میگوید و مضامین دلچسپ و نو بنور نگارنگ می آرد از نزد مہاراجہ بہادر دور و پشاور

نزد امیر کبیر دور و پیو میرو زمی یا بد نہایت مرد خلق خوش فکر دین و لا بہذا قش کم کسے
میرسد۔۔۔۔۔ صاحب دیوان است کہ نام دیوان خود ”پیشکار“
داشتہ است۔ (گلزار آصفیہ صفحہ ۲۵۴ و ۲۵۵)۔

مولوی عبد الجبار خان صوفی ملکاپوری لکھتے ہیں۔

”قیس تخلص محمد صدیق نام آپکا اصلی وطن حیدرآباد دکن ہے آپ کے بزرگ اکثر سرکار
عالی نظام مین وقائع نگاری اور اخبار گوئی کی خدمات پر مقرر تھے چنانچہ آپکے نانا محمد عاقل نائک
مجرن کے افسر تھے اور آپ کے خالو شیر محمد خان ایمان اعظم الامراء ارسطو جاہ کے مصاحب تھے
اور شعرا مین استاد الشعراء مشہور تھے آپ نے نشوونما کے بعد سن شباب مین بقدر ضرورت
فارسی عربی پڑھ کے تحریر و تقریر کی استعداد حاصل کی اور موروثی وقائع نگاری و تاریخ دانی
کا کمال پیدا کیا، شعر گوئی بھی شروع کی، کلام کی اصلاح خالوئے بزرگوار سے لیا کی۔۔۔۔۔
آپ نے ایک دیوان ریختی شاہجہان آباد کی بیگمات کی بول چال مین لکھا
فقیر مولف کو آپکا دیوان ملا تھا۔۔۔۔۔ آخر سن ۱۲۳۳ مین جان بحق ہوئے۔“

(تذکرہ شعراء دکن جلد دوم صفحہ ۹۴۱ و ۹۴۲)۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں۔

”محمد صدیق قیس متوفی سن ۱۲۳۳ شیر محمد خان ایمان کا ہمیشہ زادہ خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی وضع
کا پیر و تھا غزل کے ساتھ قصائد بھی مشہور ہیں۔“ (دکن مین اردو صفحہ ۱۲۹)

قیس ہمارا جہ چند دلال کے معاصر تھے اور بقول صوفی ملکاپوری اور نصیر ہاشمی سن ۱۲۳۳ مین انتقال کیا، اور رنگین کے
متعلق مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ اسی سال کی عمر مین سن ۱۲۵۳ مین وفات پائی (ملاحظہ ہو گل رعنا ص ۲۶۵) اس طرح قیس
اور رنگین معاصر بھی تھے اور پھر قیس نے رنگین سے اکیس سال قبل وفات پائی۔

قیس کے کلیات مین (۱۲) سطری مسطر کے (۴۴) صفحات ریختی کے بھی موجود ہیں جو ہاشمی، خاکی، رحمان، ورحیم،
معصومی کے ہندی آمیز ریختہ بالکل جدا اور رنگین کے رنگ مین رنگے ہوئے ہیں، قیس اور رنگین کی ریختی کا مطالعہ کرنیوالا ضرور
دونوں پر پہنچ سکتا ہے کہ قیس نے رنگین کے دیوان کا جواب کہا ہے یا رنگین نے قیس کے دیوان کا۔ مگر ہماری رائے اسی مین
ہے قیس نے استفادہ غیر معمولی شہرت حاصل نہیں کی تھی جو انکا دیوان حیدرآباد سے باہر نکل کر رنگین تک پہنچتا اور نہ قیس کی
وفات سے قبل یعنی سن ۱۲۳۳ سے پہلے رنگین ہی کو استفادہ شہرت حاصل ہوئی تھی جو انکا دیوان حیدرآباد تک آتا ہماری رائے
مین قیس اور رنگین نے الگ الگ کام کیا ہے یعنی قیس نے الگ ریختی کہی ہے اور رنگین نے جدا!

۵۱ نواب شمس الدین حیدر آباد دکن

رنگین اپنی ریختی کے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

”بعد حمد رب العالمین اور نعت سید المرسلین خاکپائے شعراء نکتہ چین سعادت یار خان رنگین عرض کرتا ہے کہ بیچ ایام جوانی کے یہ نامہ سیاہ اکثر گاہ بگاہ عرس شیطانی کہ عبارت حسن سے تماشا بینی خانگیوں کی ہے کرتا تھا اور اس قوم کی ہر ایک فصیح کی تقریر پر دھیان دہرتا تھا ہر گاہ چند مدت جو اس وضع پر اوقات بسر ہوئی تو اس خاص کو انکی اصطلاح اور محاورہ دن سے بہت سی خبر ہوئی پس واسطے انہیں اشخاص کے عام بلکہ خاص پولیوں کو انکی زبان میں اس بے زبان ابجد ان نے موزون کر کے ترتیب دیا۔“

(دیکھو دیباچہ ریختی رنگین و انشاء مطبوعہ نظامی پریس بدایون)

قیس کے کلیات میں ریختیوں کے آغاز پر۔

”منتخب دیوان ریختی قیس محاورہ بگیات شوخ محل بادشاہی شاہجان آباد“

لکھا ہوا ہے، گو یا ریختی، قیس کی نظروں میں محلات شاہی شاہجان آباد کی شوخ چشم بگیات کا محاورہ تھی، ملاحظہ کیجئے کہ قیس اور رنگین میں کتنا فرق ہے وہ ”عرس شیطانی“ میں جا کر خانگیوں کی تماشا بینی، ”کر کے ریختی“ کہتے ہیں اور یہ حیدر آباد میں بیٹھے ہوئے ”ولی کی شوخ چشم بگیات“ کا تصور کر کے انکے محاورے استعمال کرتے ہیں۔ گو دونوں کی رسائی ایک ہی نقطہ پر ہوتی ہے اور ایک ہی جگہ سے چل کر ایک ہی جگہ ملتے ہیں مگر خیال دونوں کا جدا جدا ہے، بعض زمینوں میں قیس اور رنگین دونوں کے شعروں کو دہین دیکھئے۔

رنگین

قیس

تو نے چڑیا وہ بنائی کہ ابھی اُلٹھے تیرے ہاتوں کے میں تران گھلانی
اتنے کیوں موتی لگائے ارئی دان ددا جہانگے بوجھ سے موتی کے میرے کان ددا
جھپٹاں منڈھے تو اس کرتی کے سیکنا تینکے ہوتے گلے میں ہے گریبان ددا
پکتا ہر تیرے ہاتوں کیلجہ میرا کچھ کو دون چیلون کو گرہ میرا مقد ددا

افسوس ہے کہ میرا مختصر کتب خانہ گلبرگہ شریف میں بے ترتیب پڑا ہوا ہے اور میں حیدر آباد میں بیٹھا ہوا روادی میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اسوقت رنگین کے دیوان کا کوئی نسخہ میرے پیش نظر نہیں ہے ورنہ اور شعر بھی اسی طرح بالمقابل نقل کرتا۔

کپڑے لتوں کا تذکرہ اپنی ریختیوں میں جس طرح رنگین نے کیا ہے اسی طرح قیس نے بھی کیا ہے، دیکھئے۔

چنپاٹکا تھا جس کے گریبان کے اوپر کرتی وہ مری کیا ہوئی پستانی جیلا
لاڈ بازار کو جاتی تو ہے صدقے تیرے بھول مت یاد سے لے آمیری ڈوری انا

بوالا دے ایسا طرح وار جو تا
کا ہے کو پہنوں کی باجی مین تھاری انگیا
جسکی چٹریا کا وہ عالم تھا کہ اب اڑ جائے
ٹو کیاں ڈھیلی ہین اور تنگ پچھاؤن مین دوا
کیا بنا لائی ہے منہیا رن مانی چوڑیاں
بد گئیں جو چوڑیاں تو بد گئیں کڑھتی ہے کیا
قیس پر کرتے تھے فرمائش کہ یوں جوڑا بنا
آگے پیچھے عاشق و معشوق کی گوٹھین لگا
جان صاحب طرح دار اکیل رکھتے ہوئے گھبراتے تھے کہ۔

جان سولی پہ رہی میسری بھیا منصور
مگر قیس نفیس سے نفیس دھوان دھار اکیل رکھتے ہین:-

اچھے رکھی ہوں دو گانا وہ طرح دار اکیل

مگر اسپر بھی اکیل کو نزدیک بلانکی ہمت نہیں ہوتی اعلیٰ دماغی تو دیکھئے۔

ابن مال کے نما۔ آتی ہے بو تچھ مین سٹری

قیس کو باوجود معصیت کے امید منہ مرت تھی۔

بخشنے والا ہے صاحب میرا دپر والا

مگر جان صاحب کا اور ہی عالم ہے کہتے ہین۔

اپنے پنے سے نہ باندھو مجھے صاحب چھوڑو

اوڑھنی اور رنجی گوؤن نے بھی لکھی ہے مگر قیس نے ایک خاص بات پیدا کی ہے۔

کیا مین کروں گی لیکے تیری ہلکی اوڑھنی

چھپے کا اسپہ کام تھا کیا خوب وا چہڑے

شعلہ سا ایک آنکھ مین میرے چمک گیا

رنگین نے اُسی خانگیوں کی تماش بینی کے بد نظر ”ڈولی“ کا استعمال کیا ہے مگر قیس بیگمات شوخ چشم کی خاطر منگواتے ہین

نوبیس

لہ یہ شاید کسی گاؤں کا نام ہے جہاں جوتے عمدہ تیار ہوتے تھے ہونگے۔

جھلا یور کا کوئی دھوان دھار جو تا
ایک سے ایک میرے پاس ہے بھاری انگیا
مین نے باجی سے جو کل شرط مین ہاری انگیا
اس طرح کوئی بھی سیتا ہے گنوار می انگیا
مین نہ پہنوں کی کبھی یہ آسمانی چوڑیاں
پہن لے چل ہاتھ ڈھیل چھوڑ جانی چوڑیاں
سبز، سا لورنہ دہانی، آسمانی چوڑیاں
دھار چھلا دھار کے کل اس مین دہانی چوڑیاں

بد نظر وہ ہین نہ رکھوں گی طرح دار اکیل

نوجوان پتلی سی، گوری سی دھوان دھار اکیل

یہ تو کہتی نہیں مین نیک ہوں بدکار ہوں مین

لاکھ مکاروں کی مکار ہوں بدکار ہوں مین

کوٹھے پہ جو ٹھکتی تھی وہ کل کی اوڑھنی

سر پر سے انکے وہ جو کہیں ڈھلکی اوڑھنی

کا استعمال کیا ہے مگر قیس بیگمات شوخ چشم کی خاطر منگواتے ہین

نوبیس

لہ یہ شاید کسی گاؤں کا نام ہے جہاں جوتے عمدہ تیار ہوتے تھے ہونگے۔

مجھ کو رخصت دے اب میرے گھر سے لیکے پنیں اسیل آئی ہے

ڈولی "پنیں" ہی کا امتیاز نہیں ہر بات میں قیس نے بیگماتی شان نہائی ہے۔

کل پاؤں میرے دا بنے جو آئی جمیلا نیند آگئی تلوؤن کو جو سہلائی جمیلا

آتی ہے میرے گھر کو مہمان میری گھوکا آتی ہے میرے گھر کو مہمان میری گھوکا

باندی کنارے بیٹھ کے دھولا ازار بند باندی کنارے بیٹھ کے دھولا ازار بند

ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بے سن بو بو ہاتھ دھونے کو میرے لائیو بے سن بو بو

بیٹھے مسند پہ جب آکر میری سمہن بو بو بیٹھے مسند پہ جب آکر میری سمہن بو بو

قیس نے ہر ایک غزل میں ایک ایک اور بعض وقت دو دو قطعے بھی کہے ہیں۔

دو گانا تو کیا ہے کسو کے بھی آگے ارسی قیس کا کرنے مذکور باندی

قسم ہے علی جی کی کہتی ہوں تجھ سے کروں گی تیری ہڈیاں چور باندی

ہاتھ سے تیرے اے دوا۔ ناک میں جان ہے میری ایک دن ایسا کراری زہر تو بھی کھلا مجھے

کا ہیکو طعنے دینے تو دیتی ہے اسٹھٹے بیٹھتے جینے سے جی بتنگ ہے آتی نہیں قضا مجھے

بعض شعر بہت ہی صاف اور عمدہ کہے ہیں۔

ٹکڑے ہوئی جاتی ہے زبان مارے طلب کے راتب کا میرے پان بھی منگوا لی جمیلا

نل بھر گئے پیڑو میں میرے درد ہے میٹھا مت چھیڑ میں ہوں جان سے حیران دو گانا

تیری گود میں تو میں کھیلی ہوئی ہوں مری بات کا مت برا مان آ جا

ارسی قیس کے میں تو جاتی ہوں گھر کو مرے ساتھ چل تو بھی مہمان آ جا

غرض نہ کچھ کر تو بھی خوش ہوگی دل میں عجب طور کا ہے وہ انسان آ جا

ہوتی ہوں تیرے پر سے قربان میری گھوکا منہ پر تو دو شالے کو مت تان مری گھوکا

رسوائی کا مت، اب یہ خلل جائے تو اچھا باندی تو میرے گھر سے نکل جائے تو اچھا

مین آئی تھی میلے میں دو گانا سے خفا ہو جی دو گھڑی وان میرا ہل جائے تو اچھا

تم ہو پائل چمکتی ہے بجلی بیٹھو پردے میں جاؤ با جی جان

دیکھ انا تجھے دیتی ہوں میں سر کی سوگند چوک جاتی ہے میرے واسطے لاری گڈیان

کہدو یہ دو گانا سے میں شام کو آتی ہوں کل پیر بلے کی درگاہ کو جاتی ہوں

۱۔ یعنی شمع سے عادت سے نئے نئے طرح سے پائل اور بھلن لڑکیوں کو بجلی چمکتے وقت ہٹا دیتے ہیں عورتوں کا خیال ہے کہ ان پر بجلی گرنا چاہی ہے نہ جانے یہ پیر بلے کون تھے آج تک ہم نے نام بھی نہیں سنا۔ (ت ک)

مذہب تو جوانی کے ہے اب چور زناخی بھرتی نہیں آنکھوں میں تیرے چور زناخی
 بعض جگہ ایسے دالہا نہ شعر کہدے ہیں کہ جی بوٹ جاتا ہے۔
 کیا جانے کیا ہوگی جوانی میں یہ آفت کو کی بھی میری ایک دھوان دہارے گویان
 کیا دھوان دہارے پر کالہ آتش آف رہے آگ لینے جو وہ آئی تھی پڑوسن بو بو
 بعض بعض پتے پتے کی باتیں بھی کہہ گئے ہیں مگر بڑے مزے سے،
 رات مجھے جگا جگا تو نے کیا ہے رات جگا اب بھی نہیں ہے جی بھرا سونے دے مت جگا مجھے
 رات کو تھے پہ تیری دیکھ لی چوری اتا کالی اوپر تھی چڑھی نیچے تھی گوری اتا
 کبھی میلاد لکھنے کے لئے نکلتی ہیں اتا ملکتی تھرتی، بے دھڑک آگے آگے ہو سیتی ہے تو فرماتی ہیں:-
 اتا تجھے کیا ہو گیا چھاتی پہ لے کپڑا اس بھیڑ میں چھاتی کوئی کل جائے تو اچھا!
 مصرعہ ثانی عریاں ہے مگر بے ساختہ ہے۔
 ایک شعر اور اسی رنگ کا کہا ہے۔

لوگ سُن لینگے ہٹر جا کم بخت بولتی میری چار پائی ہے

قیس نے بعض کھلی ہوئی باتیں بھی کہی ہیں جو بیودگی کی حد تک پہنچ گئی ہیں تو نشتاً بعض مصرعے نقل کئے جاتے ہیں۔

ع۔ خالی جو لڑاتی ہے بلبل تو لڑاتی ہوں

یا ع۔ کل کا تو دن ہے باقی پرسون میں نہاتی ہوں

یا ع۔ بن گیا بھول سمٹ غنچہ سو سن بو بو

ایسے شعر بہت کم ہیں۔ رنگین اور جان صاحب کی طرح اکثریت نہیں۔

ایک شعر سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ قیس نے عنقوان شباب میں رنجی کہی ہے اور یہ قرن قیاس بھی ہے۔

قیس کو میں نے دیکھی ہوں کل سبزہ بھی آغاز نہیں اچھی اٹکی باجی تو نے جا کر کورے با لم سے
 ایک دھنی شاعر کا جس نے کبھی دلی کی صورت نہ دیکھی ہو اس بے تکلفی سے ”بیگمانی اردو“ کا استعمال کرنا نہ صرف حیرت انگیز بلکہ
 تعجب خیز بھی ہے، قیس نے دلی کی زبان ہی استعمال نہیں کی بلکہ جا بجا ضرورتاً دھنی محاورے بھی استعمال کئے ہیں اور اس
 لطف کے ساتھ کہ دکنیت کا شبہ تک نہیں ہوتا۔ بخلاف رنجی کے قیس کا رنجیتہ ایسا نہیں ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ قیس
 دھنی تھے اور قدم قدم پر دکنیت نظر آئیگی۔
 ”سید تمکین اکاظمی“

باب المراسلة والمنظره

ایک صاحب جن کا نام ضیاء الدین احمد خاں ہے اور جو ضلع اٹارہ میں گرو اور قانون گو کی خدمت پر مامور ہیں نگار کے قدیم خریدار تھے۔ ان کی میعاد خریداری چونکہ جون ۱۹۲۹ء میں ختم ہوتی تھی اس لئے مینجر نگار نے حسب معمول ان سے آئندہ کی خریداری کے متعلق استصواب کیا۔ جس کا جواب یہ آیا کہ ”بعض حالات کی بنا پر جن کا تعلق معتقدات سے ہے وہ آئندہ خریداری سے معذور ہیں۔“ مینجر نے ان کو لکھا کہ ”اگر نگار کے مذہبی مقالے آپ کے معتقدات کے خلاف ہیں تو بھی اُن کا مطالعہ آپ کو کرنا چاہئے تاکہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ ایک مذہب کی صحت و سقم کا کیا معیار قائم ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے نگار میں مذہبی حصہ بہت کھوڑا ہوتا ہے، اگر آپ اُسکو نظر انداز کر دیں تو بھی کافی سامان آپ کے ادبی و علمی ذوق پورا کرنے کے لئے اس میں موجود ہوتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیے“ اس کے جواب میں اُن کی حسب ذیل تحریر موصول ہوئی۔

”مکرمی جناب منیر صاحب - تسلیم - صحیفہ گرامی موصول ہوا۔ مجھ کو خود نگار سے جدائی کا بیحد صدمہ ہے۔ مگر اس کے وجہ

یہ ہیں۔ آپ ہی مشورہ دیں کہ مجھ کو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔

مگر کو نیاز صاحب کے ہومون ہونے کا فخر حاصل ہے اور مجھے نگار سے خاص انس ہے۔ والد اجد قبلہ نہایت متشدد اور سادہ مسلمان ہیں اور ہر قسم کی بدعات کے دشمن۔ جب کبھی وہ یہاں تشریف لائے، نگار کو ملاحظہ فرمایا اور اکثر مذہب کے معاملوں میں روش پر سخت اعتراض کیا۔ میں اکثر تاویل سے کام لیتا اس مرتبہ یعنی جون نگار جس میں نیاز صاحب نے موجودہ ارکان نماز کو غیر قرآنی ثنابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے ان کی برداشت سے باہر ہو گیا اور انھوں نے سختی کے ساتھ ہدایت فرمائی کہ اس رسالہ کا مطالعہ بند کر دو۔ ورنہ میری سخت ناخوشی کا باعث ہو گا۔ اب میں مجبور ہو گیا۔ والدین کے ارشاد کی تعمیل تمام دنیاوی امور پر بحال مقدم ہے۔ ہر چند مجھے نیاز صاحب کے بتائے ہوئے مذہب سے اتفاق نہیں ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کا اثر میسر قلب پر ضرور ہے اور اب بعض سوالات اضطرابِ افقہ وحدیث کے متعلق میسر دل میں ایسے پیدا ہو گئے جنکا جواب میں نہیں دلیکتا اور نہ کسی سے پوچھ سکتا ہوں کیونکہ ان کا دریافت کرنای میرے لئے بارگاہِ دیوبندوبریلی سے فتوائی کفر وشک صادر کرنا سکتا ہے

"متع نیاز" تو خطاب پہلے ہی سے مل چکا ہے۔....."

اس تحریر نے چونکہ بعض اصولی بحثیں پیدا کر دی ہیں۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف تحریر کی تنقید اور صاحب تحریر کی تسکین کے لئے بلکہ تمام ناظرین نگار کو آگاہ کرنے کے لئے مجمل طور پر ان کو صاف کر دیا جائے۔

سب سے پہلے تو مجھے ان حضرات کی ذہنیت پر تراسف کرنا ہے جن کے نزدیک مذہب نام ہے صرف کورانہ تقلید کا اور اس قدر

پرستی کا جو نسلاً بعد نسل چلی آرہی ہے۔ گویا مذہب کوئی ترکہ یا جائیداد ہے جو میراث میں ہاتھ آتا ہے اور خود اپنے ذہن و عقل سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ حالانکہ مذہب بالکل انفرادی یقین و اطمینان کا نام ہے۔ اگر کوئی شخص کو رائے تقلید کے بعد اپنے نفس کو مطمئن پاتا ہے تو کوئی حرج نہیں اس کا مذہب وہی درست ہے اور اس کو اس راستہ سے نہ ہٹنا چاہئے کیونکہ فطرت کی طرف سے اس کے دماغ میں تفتیش و تحقیق کی اہلیت موجود نہیں ہے لیکن اگر اس کے دل میں کوئی خلش پیدا ہوتی ہے کوئی الجھن موجود ہے (جیسا کہ صاحب تحریر کے دل میں پائی جاتی ہے) تو پھر اس کا خاموش بیٹھ جانا محض اس خیال سے کہ باپ خفا ہو گا یا دیوبند اور بریلی سے کفر کا فتویٰ صادر ہو جائے گا، اس قدر عجیب و غریب فلسفہ قبول مذہب کا ہے کہ کم از کم میراث میں اس کے فہم سے بالکل قاصر ہے۔

اگر میرے مذہبی مقالات نے میرے محترم دوست کے دل میں کوئی کیفیت مستفسرہ پیدا کر دی ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ان کا یقین سابق متزلزل ہو گیا ہے اور وہ کبھی اپنے آپ کو راسخ الاعتقاد نہیں کہہ سکتے جب تک ان کی خلش دور نہ ہو جائے اور اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ یا تو وہ خود غور کر کے کسی نتیجہ پر پہنچیں یا دوسروں سے دریافت کر کے یکسوئی حاصل کریں۔ ایسی صورت میں تو نگار کا مطالعہ اور ضروری ہو جاتا ہے نہ کہ اس سے احتراز و بیزاری۔ علاوہ اس کے یہ بھی ایک سہل و سادہ (اور خصوصیت کے ساتھ ایک مسلمان) کی حد درجہ کمزوری ہے کہ وہ تحقیق و تنقید سے خائف ہو اور یہ اندیشہ کرے کہ اس کا مذہب اس کی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا تو اعتقاد ہے کہ دنیا کا اگر کوئی مذہب سخت ہی سخت تنقید کے بعد بھی پورا تر سکتا ہے تو وہ اسلام ہے اور ایک مسلمان سے زیادہ بے خوف اس باب میں کوئی نہیں ہو سکتا، بشرط آنکہ مذہب نام اس ابلہانہ اتباع کا نہ ہو جو اس وقت کم سواد علماء کے گمراہ کن تعلیمات سے ہر جگہ نظر آتا ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ صاحب تحریر اس کو دنیاوی امور میں شامل کر کے والدین کے ارشاد کی تعمیل کو اس پر مقدم چاہتے ہیں حالانکہ جب کوئی خطرہ قلب پر مذہب کے باب میں مستولی ہو گیا اور بعض سوالات اضطراباً ایسے پیدا ہونے لگے جن کا وہ خود کوئی جواب نہیں دے سکتے تو یہ حالت دنیاوی امور سے بالکل علیحدہ ہو گئی اور اس کا تعلق معتقدات مذہبی سے ہو گیا، جہاں خود ارشاد نبوی کے مطابق والدین کا فرمان بھی اپنی ساری اہمیت کھو بیٹھا ہے اگر خدا نخواستہ کل کو ان کے والد محترم کسی اور مسلک کو اختیار کر لیں اور ہمارے معزز دوست کو اس کے اتباع پر مجبور کریں تو کیا وہ اپنے موجودہ مسلک کو صرف اس لئے ترک کر دیں گے کہ والدین کے ارشاد کی تعمیل مقدم ہے اور لکھدینکم و لی دین کی ہدایت کو نظر انداز کر دیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتے تو پھر حیرت ہے کہ باوجود دل میں خلش رکھنے کے وہ کیونکر ان کے فرمان کی تعمیل کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ اس کا تعلق یکسر مذہب و معتقدات مذہب سے ہے۔

دوسرا مسئلہ ارکان نماز کو ”غیر قرآنی“ کہنے کے متعلق ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسپر کسی کو برہمی کا کیا سبب پیدا ہو سکتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ نماز کی موجودہ صورت ”غیر الہامی“ یا ”غیر محمدی“ ہے قرآن میں بہت سی باتوں کا ذکر نہیں ہے۔

بہت سی ہدایات ایسی ہیں جو صرف رسول اللہ کے اقوال سے مستنبط ہوتی ہیں، تو کیا ہم ان کو ”غیر قرآنی“ کہہ کر ان کی اہمیت سے انکار کر سکتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہو گئے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک ”متلو“ دوسری ”غیر متلو“ قسم اول کو قرآن کہتے ہیں اور قسم دوم کو ”احادیث“۔ اس لئے اگر نماز کا موجودہ صورت اور اس کے جملہ ارکان کی صراحت قرآن مجید میں نہیں ہے بلکہ رسول اللہ کے طریق عمل سے ثابت ہوتی ہے تو کیا ہم اس کی اہمیت کو نظر انداز کر سکتے ہیں اور اس کو غیر قرآنی کہہ کر جبکہ واقعی قرآن میں اس کی تفصیل و صراحت موجود نہیں ہے اس کی فرضیت سے قطع نظر کر سکتے ہیں۔

میں نے اگر ارکان نماز کے متعلق یہ دعویٰ کیا تھا کہ ان کی تفصیل کلام مجید میں نہیں ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں تھا کہ میں ان کو غیر ضروری سمجھتا ہوں بلکہ مدعا صرف ایک واقعہ کا اظہار تھا اور ضمناً یہ بتانا تھا کہ خدا کے نزدیک ارکان عبادت کی تفصیل سے زیادہ اس کے غایت کا اظہار ضروری تھا جس کو ہلو گون نے نظر انداز کر دیا ہے۔

مجھے حذور جہ انفس ہے کہ بعض حضرات میرے مضمین کو پڑھ کر ایسے تلخ پیدا کر لیتے ہیں جو نہ نفس مضمون سے کوئی تعلق رکھتے ہیں اور نہ میرا مقصود ہوتے ہیں۔ اگر میں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ارکان نماز کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، تو اس کے یہی معنی لینے چاہئے تھے جو ان الفاظ سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے ہٹنے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور نہ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا کہ میں نماز کا مخالف ہوں یا اس کو ضروری نہیں سمجھتا۔

اسی سلسلہ میں میں اپنے معزز دوست سے عرض کروں گا کہ اگر واقعی ان کے دل میں کوئی ایسی خلش پیدا ہو گئی ہے جس کو وہ دور کرنا چاہتے ہیں تو دیوبند اور بریلی کے فتوائے کفر و شرک سے نہ ڈریں، کیونکہ اول تو اب ان بارگاہوں کی کوئی وقعت ہی نہیں رہ گئی ہے کہ ان کے احکام کو کوئی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے اور دوسرے یہ کہ کفر و اسلام کا معاملہ صرف خالق و مخلوق کے درمیان کا معاملہ ہے جس میں نہ کرنا کا تبین، کو بھی دخل دینے کی ضرورت نہیں، چہ جائیکہ اہل دیوبند و بریلی جنہوں نے کبھی خدا کی ہستی کو اہرمن کی ہستی سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔

نیاز

تصویر قاصہ

بنگال کے مشہور نقاش و مصور مزدار کی ایک بہترین تصویر جو حضرت نیاز کے مشہور مضمون ”قاصہ کے گجراتی ترجمہ کے ساتھ کلکتہ کے مشہور گجراتی رسالہ نوجین میں شائع ہوئی تھی۔ قیمت (۱۴) روپیہ منیچر نگار“

تصویر زیب نساجیم

جو دربار عالمگیری کی ایک بے مثل مصورہ نادرہ کے قلم کا ہے اور بعد تحقیق و تنقید بسیار اس کی صحت کی توثیق ہو چکی ہے یہ تصویر تین خوشنما رنگ سے طیار کی گئی ہے اور اس کے نگارین شائع ہو چکی ہیں قیمت منہ محصول (۱۸)

الاستفاد

حقوق اللہ و حقوق العباد

(جناب ناظم حسین صاحب - گوالیار)

کہا جاتا ہے اور غالباً ہر مسلمان کا اعتقاد ہے کہ انسان کے فرائض اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق پر مشتمل ہیں اور خدا اگر چاہے تو اپنے حقوق کے ترک کرنے والے کو معاف کر دے، لیکن بندوں کے حقوق ادا نہ کرنے والوں کو وہ معاف نہ کرے گا بعض وقت اعمال کی اس تفریق کے سمجھنے میں مجھے الجھن پیدا ہوتی ہے اور ذہن میں ایک خاص تشویش محسوس کرتا ہوں کہ یہ تفریق کیوں اور کیسی ہے اور اس سے کیا نتیجہ ملتا ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ میں کوئی شافی گفتگو کر کے مجھے مطمئن کر سکیں گے۔

”نگار“ ”حقوق اللہ اور حقوق العباد“ کا مسئلہ بھی منجملہ اُن دیگر مسائل کے ہے جن کو معتقدات اسلامیہ سے غیر متعلق ہونے کے باوجود غلطی سے جزو ایمان و اسلام قرار دے لیا گیا ہے اور وہ ہر وہ شخص جو اسلام و اسلامیات پر تنقید کرنے کے بعد پورے اطمینان نفس کے ساتھ مسلمان ہونا چاہتا ہے وہ اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہو گا اور ہونا چاہیے۔

اول اول جب مذاہب عالم کی تفتیش و مطالعہ کے سلسلہ میں مذہب اسلام میری جستجو و تحقیق کا مرکز قرار پایا اور وہاں مسائل سے گزر کر جزئیات تک پہنچا تو میرا ذہن بھی اس مسئلہ میں آپ ہی کی طرح مشوش ہوا اور آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ فرائض انسانی کی یہ تقسیم ممکن ہے کسی صحت کے لحاظ سے درست ہو لیکن حقیقت کے اعتبار سے بالکل نادرست ہے۔ قبل اس کے کہ میں ان دلائل کو پیش کروں جنکی بنا پر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ یہ بتادینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرض اور حق میں کوئی فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ جس کی طرف سے اداے فرض کا مطالبہ ہوتا ہے وہ اس کو حق کہہ کر طلب کرتا ہے اور جو ادا کرتا ہے وہ اُسے فرض کے نام سے موسوم کر کے انجام دیتا ہے اس لئے اگر حق کا مفہوم متعین ہو جائے تو فرض کی صورت بھی متعین ہو سکتی ہے اور اس کی غایت کا بھی علم ہو سکتا ہے۔

اداے فرض یا حق نام ہے کسی ایثار یا احسان و کرم کے اعتراف کا ایثار کے ذریعہ سے یا کسی اور ایسے ذریعہ سے جسے احسان کرنے والا اپنے لطف و کرم کا معاوضہ سمجھ سکے۔ ایک شخص کی احتیاج کو ہم پورا کرتے ہیں تو اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ

وہ کسی وقت ہمارے بھی کام آئے اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو تمارے فرض کملائے گا، اسی طرح ایک شخص ہم کو قرض دیتا ہے تو ہمارا فرض ہوتا ہے کہ اُس کو وقت معین پر ادا کر دیں اور اس کے احسان کی تلافی کر دیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو فرض کے ترک کرنے والے کملائیں گے ایک صورت تو یہ ہوتی ہے جب کہ حق کا طلبگار اور ادا سے فرض کرنے والا دونوں احتیاج کے لحاظ سے قریب ایک سطح پر ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ احسان کرنے والا بہت بلند ہو اور وہ اس کے معاوضہ کا وقت احسان بظاہر محتاج نہ ہو اس صورت میں ایک معنوی اور اخلاقی احساس احسان کا تو ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے عوض کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مثلاً یہ کہ ہم کسی نہایت ہی مفلوک الحال فقیر یا پابج کی کچھ مالی اعانت کریں تو اس وقت نہ ہمارا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کا عوض اس سے کسی وقت چاہیں گے اور نہ اس کے ذہن میں یہ بات آ سکتی ہے کہ کبھی اس کا عوض دینا پڑے گا۔ لیکن اگر کسی وقت ہم اس کی طرح مفلوک الحال ہو جائیں اور وہ ہماری طرح دولت مند یا کسی اور صورت سے ہم کو اس کی مدد کی ضرورت لاحق ہو جائے تو پھر اس کے ادا کئے جانے کا سوال از خود پیدا ہو جائے گا گو بحالت موجودہ ہم اور وہ دونوں اس سے خالی الذہن ہیں۔ تیسری صورت ایک اور ہے۔ وہ یہ کہ احسان و کرم کرنے والی ذات ایک ایسا انمولی مبدع و منبع ہے جو بلا تخصیص و تعین بلا غرض و سبب لطف عظیم کی عادی ہے جیسے آفتاب کا وجود کہ اس کی روشنی کوہ و راغ، صحرا و باغ، وادی و مرغزار ہر جگہ یکساں جاں بخش و حیات افروز ہے یا پھول کی نگہت کہ اس کی شامہ نوازی کسی مخصوص و محدود زمان و مکان کے لئے مختص نہیں ہے یا ابرطیر جس کے نزدیک شاہ و گدا، نشیب و فراز، شب و روز، صبح و شام کسی چیز کی تخصیص نہیں ہے ایسی صورت میں کوئی سوال حق و فرض کا پیدا ہوتا ہے نہ اس کے ادا کئے جانے کا۔

خدا اور انسان کا تعلق اگر کسی شق میں آ سکتا ہے تو وہ یہی تیسری صورت ہے، کیونکہ ذات خداوندی کے انعامات بغیر کسی وجہ و سبب بلا کسی غرض و غایت کے ہر ایک ہستی و مخلوق پر یکساں ہیں اور اگر آج تمام نوع انسانی بلکہ جملہ مخلوق ان سے منکر ہو جائے تو بھی اس کے الطاف اسی حال سے جاری رہیں گے اور ان کے اعتراف یا عدم اعتراف سے ان کے استمرار و دوام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ جس کی طرف سے کسی حق کا مطالبہ ہوتا ہے یا جس کا کوئی حق ہم اپنے اوپر تسلیم کرتے ہیں، تو گویا ضمنی طور پر اس کا کسی حد تک صاحب احتیاج ہو یا بھی تسلیم کرتے ہیں ورنہ مطالبہ و ادا سے فرض کا مفہوم بالکل لغو قرار پاتا ہے، اس لئے اگر خدا کا کوئی حق بندوں پر ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر فرض ہوتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں اور وہ یہ کہ خدا کا ہکو پیدا کرنا، عقل و ادراک کی نعمت بخشنا، دنیا کے نفع و لذت مہیا کرنا، کوئی ایسی غایت و غرض رکھتا تھا جس میں شاید خود خدا کا کوئی فائدہ تھا اور اس لئے ہمارا اس کے فائدہ کو ان احسانات کے عوض میں نظر انداز کر دینا ایک ایسی غلطی و سرکشی ہے جس کی سزا ہمیں ملنا چاہئے۔ حالانکہ خدا کی ذات اس قدر بلند ہے کہ اس کے ساتھ کسی سبب یا غرض کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی اور وہ ہر قسم کے تاثرات سے بے نیاز ہے۔

اگر حقوق اللہ میں کوئی چیز ایسی ہو سکتی ہے جس کا احساس فطرت کی طرف سے ہر شخص میں ودیعت کیا گیا ہے تو سب سے

پہلے اس کی ذات اور وجود کو تسلیم کرنا ہے۔ لیکن اگر آج کوئی اس سے انکار کر دے بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ اس کو گالیاں دینے لگے، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ خدا اس سے ناخوش ہو جائیگا اور اپنے اُن انعامات عظیم سے اُسے محروم کر دے گا جو بلا کسی سبب کے اُس نے ہر شخص کے لئے ارزانی کر رکھے ہیں؟ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خدا اور اس کے کاروبار کو بالکل دنیاوی اصول زندگی کے لحاظ سے دیکھتے ہیں اور اس کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔ ہم خدا کی حقیقت سمجھنے اور سمجھانے کے لئے بڑے سے بڑے بادشاہ کی مثال پیش کرتے ہیں اور جس طرح یہاں ایک بادشاہ کے حقوق رعایا پر ہوتے ہیں اسی طرح خدا کے حقوق کو بھی بندوں پر ثابت کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ عوام کے سمجھانے کے لئے اور اُن کے اخلاق کی تہذیب و تربیت کے لئے یہ ایک مفید طریق کار ہو، لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے معاملہ بالکل اس کے خلاف ہے اور خدا کی حقیقت یا اس کے ساتھ تعلق مخلوق کو سمجھنے کے لئے ہم عالم حواس و ادراک کی کسی چیز کو مثال یا تشبیہ کی صورت سے پیش ہی نہیں کر سکتے ایک ایسی ذات جو یکسر غنا ہے، جو بے نیازی کے سوا کچھ نہیں، جو ازل سے لیکر لا نہایت تک صرف ایک قوت کا منہ کی حیثیت میں ذرہ سے لیکر آفتاب تک ہر جگہ کار فرما ہے اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس کے بندوں پر حقوق ہیں، یا وہ ہم سے کسی فرض کی ادائیگی اپنے لئے چاہتی ہے میرے نزدیک ذات باری کا استحقاق اور معنوی شکر ہے

اب آپ اصولی گفتگو سے ہٹ کر نیچے آئے اور دیکھئے کہ جن باتوں کو خدا کے حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ کیا ہیں اور ان میں کونسی وہ خصوصیت ہے جو ”حق اللہ“ کو ہم پر ثابت کرتی ہے ہر مذہبی تعلیم و چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ عبادات و معاملات انعامات کو تو چھوڑیے کیونکہ وہ بین طور پر حقوق العباد سے متعلق ہیں۔ رہی عبادات سو حق اللہ کو انھیں سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ درانحالیکہ ان میں سے ایک بھی حق اللہ نہیں ہے اور عبادت خواہ کسی صورت سے ہو حقوق العباد ہی سے متعلق ہے بلکہ ان میں سے جہاں تک عبادت کا تعلق ہے اس میں نماز، روزہ، حج داخل ہیں اور انھیں کو حق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب آپ انھیں کی حقیقت پر غور کر لیجئے کہ وہ خدا کا حق کیونکر ہو سکتی ہیں اور خدا کو ہماری عبادات کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ لوگ جو نماز، روزہ اور حج کو حق اللہ میں داخل کرتے ہیں، وہ بھی غالباً اس امر کا انکار نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کوئی عبادت ایسی نہیں ہے جو صرف ہمارے ہی فائدہ کے لئے نہ بتائی گئی ہو۔ مثلاً نماز کو لیجئے کہ اس وجہ سے جو طہارت پاکیزگی کا خیال پیدا ہوتا ہے وہ خود ہماری ہی صحت کے لئے مفید ہے، یا جو اجتماع دیکھتی کی صورت صفا بستہ عبادت گزاروں میں پائی جاتی ہے وہ خود ہماری اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے لئے کس درجہ کارآمد ہے یا ”فخشاہ و منکر“ سے باز رہنے کی صورت میں جو تزکیہ اخلاق رونما ہوتا ہے وہ کس حد تک ہماری قومی و انسانی ارتقاء کا ضروری جزو ہے۔ اس لئے اگر ہم تارک الصلوٰۃ ہیں تو اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنی اجتماعی و تمدنی ترقی کے لئے سعی نہیں کرتے، ہم دنیا میں سعادت و خوشحالی حاصل کرنے کی طرف سے متوجہ نہیں ہوتے اور اس طرح گویا نماز کا ترک کرنا اُن حقوق کو پامال کر دینا ہے جو قوم کی طرف سے اس کی ایک ایک فرد پر عائد ہوتے ہیں اور داعیات قومی کی پرواہ

نہ کہنا یقیناً قوم کا گناہ ہے جسے صرف حق العباد ہی سے متعلق کیا جاسکتا ہے۔ حج چونکہ نماز باجماعت ہی کی ایک زیادہ وسیع صورت ہے اور اس کا مقصد بھی محض اخوت عامہ کی بنیاد کو مستحکم کرنا ہے اس لئے اس کا بھی حق العباد میں شامل ہونا ظاہر ہے۔ یہی حال روزہ کا ہے کہ اس کی تاکید بھی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ ہم اپنی قوم کے مسکین و بیکس افراد کی حالت کا احساس کر سکیں اور ان کی مدد کی طرف متوجہ ہوں اور اگر یہ جذبہ ہم میں پیدا نہیں ہوتا تو روزہ بالکل بے معنی چیز ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ عبادت بھی سراسر حق العباد سے متعلق ہے۔ الغرض دنیا میں کوئی عبادت یا کوئی طریق نیایش ایسا نہیں ہو سکتا جو حق اللہ کہلایا جائے۔ کیونکہ خالق و مخلوق کا رشتہ ایک ایسے غنی و محتاج کا رشتہ ہے جس میں حق کے پیدا ہونے یا اس کے ادا کئے جانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

رہا یہ امر کہ جب حقیقت یہ ہے تو کیوں ایسا بتایا گیا اور تقسیم و تفریق حق کی کس غرض سے کی گئی اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ مذہب اور فلسفہ مذہب دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں، یعنی یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص فلسفہ مذہب جانتے کے بعد مذہب اختیار کرے۔ کیونکہ جو نتائج محض کسی مذہب کے اختیار کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ ہر حال بغیر فلسفہ مذہب کے علم کے بھی مترقب ہو سکتے ہیں اور اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو پہلے کسی عبادت یا فعل حسن کی فلسفیانہ حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے بلکہ اگر ہم یہ دیکھیں کہ کوئی شخص بغیر ان موثر گانہوں کے علم کے احکام خداوندی پر اچھی طرح کار بند ہو سکتا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اس کو اس طرف سے بے خبر ہی رکھیں طبقہ عوام میں چونکہ علمی توجہوں کے سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی اور نہ وہ ان کی اہمیت سے واقف ہو سکتے ہیں اس لئے ان کے لئے یہی مناسب ہے کہ ان کو عبادت یا تسلیم اخلاق کی طرف بالکل اس انداز سے راغب کیا جائے جس طرح ہم بچوں کو مختلف پیرایوں سے کسی امر کی طرف راغب یا کسی بات سے متفر کرتے ہیں۔ ایک بچہ ہاتھ میں چاقو لیکر کھیلنے لگتا ہے اور ہم اس سے یہ نہیں کہتے کہ دیکھو اس میں تیز دھار ہے جس کا استعمال تم نہیں جانتے اور اندیشہ ہے کہ تمہاری بے احتیاطی سے یہ جسم کو بھروسہ کر دے۔ بلکہ اس سے گھر کر یہ کہتے ہیں کہ چاقو پھینک دو نہیں تو کن کٹی ہو جائیگی بلی پکڑ لیجائے گی کتا کاٹ لیگا وغیرہ وغیرہ اور وہ خائف ہو کر چاقو پھینک دیتا ہے، حالانکہ حقیقت ان میں سے ایک بھی نہیں ہے اور نہ ہمارے اس کہنے کو کوئی کذب و دروغ کہتا ہے انبیاء کرام اور اکابر دین نے بھی تبلیغ و ہدایت کے لئے یہی فلسفہ اختیار کیا تھا کہ عوام کی ذہنیت اور ان کے نارسید و عقول کو دیکھ کر اعمال و افعال کے عواقب و نتائج اور اسباب و علل سمجھائے تھے۔ اگر ایک جاہل کے سامنے نماز کی حقیقی روح پر لکھ دیا جائے اور اس کو بتایا جائے کہ اس میں یوں اجتماعی فوائد مضمون ہیں تو اس کے نزدیک نہ نماز میں کوئی اہمیت باقی رہے گی اور نہ وہ اس کے پابندی کرے گا، لیکن اگر اس سے صرف یہ کہلایا جائے کہ دیکھو یہ خدا کا حکم ہے، خدا کا حق ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے تو ایک خاص قسم کی خشیت اس پر طاری ہو جائے گی، وہ اس کا پابند بن جائیگا اور آخر کار وہ نتیجہ از خود بغیر اس کے علم کے پیدا ہو جائیگا جو نماز کی پابندی سے پیدا ہونا چاہئے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی بحث طلب ہے کہ کسی مصیبت کو خدا کا معاف کر دینا کیا معنی رکھتا ہے۔ میرا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کا کوئی حق بندہ پر نہیں ہے، اسی طرح خدا کو عفو و درگزر یا تعذیب و قہر پر سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یعنی جس طرح ایک انسان کے اعمال حسنہ خود اس کے لئے مفید ہیں اسی طرح اعمال سیئہ اس کے لئے مضر ہیں اور اس فائدہ و مضرت کا دوسرا نام ثواب و عذاب ہے۔ خدا کی شان اس سے بہت بلند و ارفع ہے کہ وہ ہمارے اچھے کاموں کی تحسین اور برے کاموں کی تشنیع کے لئے کوئی اہتمام کرے۔ ہمارا عذاب و ثواب ہماری دوزخ و جنت خود ہمارے اندر اور ہمارے ساتھ ہے جو بالکل اس طرح لازمی طور پر ظہور پذیر ہو جاتی ہے جس طرح دو اور دو کا نتیجہ چار۔ اگر ہم ان ہدایات پر عمل نہیں کریں گے جو شارع نے بتائے ہیں تو اس کا نتیجہ از خود ہمارے اور ہماری قوم کے حق میں برپا پیدا ہو گا اور اگر ان پر کار بند ہوں گے تو ہم خود اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔ خدا نے جو سلسلہ اسباب و علل اور نتائج کا پیدا کر دیا ہے اس کے مطابق تمام مظاہر و دنا ہوتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ جس میں خدا کی معافی یا سزائش کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس جگہ یہ خشک پیدا ہوتا ہے کہ کلام مجید میں اکثر جگہ خدا نے عذاب و ثواب کو اپنے سے تعلق کیا ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً اس سے قبل اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں لیکن مختصراً پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ نہ صرف مذہبی مان کا انداز بیان ہے تاکہ عوام پر اس کا اثر ہو بلکہ ایک لحاظ سے حقیقت بھی ہے کیونکہ خدا کے بتلے ہوئے اصول سے منحرف ہو کر یا ان پر کار بند ہو کر نقصان و نفع اٹھانا گویا اس کے مقرر کردہ نتائج کو حاصل کرنا ہے جسے ہم بجا طور پر ہر وقت خدا سے منسوب کر سکتے ہیں۔

دوسرا شبہ یہ بھی وارد ہو سکتا ہے کہ خدا نے جابجا ”مغفرت ذنوب“ کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمارے کسی گناہ کا بڑا نتیجہ نہ پیدا ہو گا۔ بلکہ اس سے مدعا صرف یہ ہے کہ اگر ہم معاصی سے باز آجائیں گے تو ان کے اثرات بھی رفتہ رفتہ محو ہو جائیں گے اور یہی گناہوں کی بخشش و معافی ہے۔

نماز کی موجودہ صورت

(میں رس مصوفیہ صاحبہ عیسیٰ میان بازار حیدر آباد وکن)

وہ آپ کے سن ملن نے جہان مولویوں کی جماعت کے دفا کو جو ہم ناقص العقل عورتوں کے ذہن میں تھا گھٹا دیا وہاں ہمارے ان عقائد کو بھی کمزور کر دیا جن کو ہم نے باپ و ادا سے سیکھا اور جن پر اپنے شوہر دن کے سامنے بلا خوف تردید اب تک عمل پیرا رہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میں آپ کا رسالہ ہر ماہ پڑھتی ہوں اور صبحی چیزیں قرین عقل و قیاس ہوتی ہیں ان کو درست

ہی نہیں جانتی بلکہ اپنے عمل بھی کرتی ہوں۔ مگر جولائی کے رسالہ میں ملاحظیات پڑھنے کے بعد میرے دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا ہو گیا ہے اور عجیب قسم کے خطرات پیدا ہو گئے جن کا علاج میں خود نہیں کر سکتی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اگر قرآن شریف میں نماز کے متعلق اور خاص کر رکوع و سجود کے متعلق قطعی احکام صادر نہیں ہوئے ہیں تو پھر یہ نماز جو ہم پڑھتے ہیں درست ہے یا نہیں۔ کم از کم میں یہ سمجھتی ہوں کہ خداوند بزرگ نے ہر نماز کے احکام رسول کریم کے توسط سے صادر فرمائے۔ اور اب یہ بتا ہے کہ جس طرح سے نبی کریمؐ نے ان احکام کی پابندی کی اور عملی پیرایہ میں جس طرح ہمارے آگے پیش کیا وہ قابل تقلید ہے یا نہیں براہ مہربانی میرے اس سوال کا جواب آئندہ پرچے میں رقم فرما کر میرے شہادت دور فرمائیے ورنہ اس کج عقیدگی کو جو آپ کی تحریر سے میرے دلیں پیدا ہو گئی ہے میں آپ کی طرح سے سمجھوں گی اور آپ جیسے عالموں پر لازم ہے کہ ان شکوک کو رفع کریں جو آپ کی تحریر کی وجہ سے پیدا ہو گئے ہوں۔ فی الوقت میں اس سے زیادہ نہیں لکھ سکتی البتہ آئندہ نگار میں جواب پڑھنے کے بعد اپنے خیالات پریشان کو قلم بند کر کے روانہ کر دینی دوسرا سوال یہ ہے کہ گراموفون کے ذریعہ سے اگر اذان مقرر کی جائے تو درست ہوگا یا نہیں

دنگار ”آپ کی تحریر پڑھ کر مجھے خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی تو اس لئے کہ آپ اُن تنگ نظر اور کوتاہ خیال لوگوں میں نہیں ہیں جو اپنے عقاید و موعومات کے خلاف کوئی بات سننا پسند ہی نہیں کرتے، خواہ وہ کتنی ہی صداقت کے ساتھ کیوں نہ کہی گئی ہو، اور افسوس اس بات پر ہوا کہ آپ نے میری تحریر کو غور سے نہیں پڑھا اور خواہ مخواہ آپ کے دل میں نماز کی درستی کے طرف سے شک پیدا ہو گیا حالانکہ میرا مقصود وہ نہ تھا جو آپ نے یا بعض اور حضرات نے سمجھا نماز یا عبادت کی جو موجودہ صورت و ہیئت مسلمانوں میں پائی جاتی ہے وہ بادی اختلاف دہی ہے جیسے رسول اللہؐ نے بتایا، صحابہ نے عمل کیا اور اُس وقت سے لیکر تا ایندہ مسلمانوں کے مذہبی مرکزیت کا بڑا راز اس میں پوشیدہ رہا ہی کیونکہ اسی نے ہماری اجتماعیت کو قائم رکھا اسی نے ہمارے اندر جذبہ اخوت و ہمدردی پیدا کیا اور بلا خوف تردید اس کو ایک بہترین طریقہ عبادت کے صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا نماز صرف قیام، قعود، رکوع و سجود کا نام ہے، کیا عبادت سے مراد محض چند اعضا کی جنبض و حرکت ہے، ظاہر ہے کہ کوئی شخص اس کا مدعی نہیں ہو سکتا اور نہ دنیا کا کوئی مذہب یہ کہہ سکتا ہے کہ عبادت کا مدع صرف جھکنے، سجدہ کرنے یا کھڑے ہو جانے سے پورا ہو سکتا ہے۔

انسانی حرکات اگر وہ بے اختیارانہ طور پر سرزد ہوں، تو ہمیشہ ان کو جذبات کا تابع سمجھا جاتا ہے اور اسی لئے صورت کو دیکھ کر قلب کی حالت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے سامنے بے اختیارانہ بات جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے یا جھک کر ہمارے قدم چھوتا ہے، یا سامنے زمین پر سر ٹیک دیتا ہے تو اس کے صرف ایک ہی معنی ہو کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اس نے اپنے آپ کو ہمارے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے، اپنی خطاؤں سے پشیمان ہے، اپنی عاجزی کا اعتراف کرتا ہے اور آئندہ کے لئے طاعت و وفاداری کا عہد کرتا ہے۔ لیکن اگر ہمیں کسی طرح معلوم ہو جائے کہ اس کے یہ ظاہری خوشامد حقیقت سے دور ہے

اور اس کے دل میں بدستور سرکشی پائی جاتی ہے تو ہم ایسے آدمی کو ٹھکرا دیتے ہیں اور اس کے اظہارِ عجز و نیاز پر رحم کرنے کے بجائے اور زیادہ بیزارگی کا اظہار کرتے ہیں۔

بالکل اسی پر نماز کو منطبق کر لیجئے کہ اگر ایک شخص کار کو عروج و سجود حقیقتاً دل کی اس کیفیت کے ساتھ ہے جو بے اختیارانہ طور پر انسان کو جھک جانے کے لئے مجبور کرتی ہے تو اس کی نماز واقعی نماز ہے، ورنہ اک فعل عبث ہے اور خدا کی توہین ہے اس لئے ظاہر ہوا کہ نماز و عبادت سے اصل مقصود صرف ایک کیفیتِ عبودیت اپنے اوپر طاری کرنا اور معاصی و منافی سے محترز رہنے کا عہد و اہم کرنا ہے اور اسی مقصود کے ساتھ رسول اللہ نے اس کی پابندی مسلمانوں پر عاید کی تھی میرا مدعا یہ کہنے سے کہ نماز کی موجودہ ہیئت و صورت کے ذکر سے کلام مجید ساکت ہے یہ نہیں ہے کہ وہ کوئی فعل عبث یا غیر ضروری ہے یا یہ کہ رسول اللہ نے اس کا حکم نہیں دیا بلکہ یقیناً وہ نہایت اہم و ضروری ہے اور رسول اللہ نے ہمیشہ اس کی پابندی کی اور دوسروں کو پابندی کی ہدایت نہایت شدت سے کی، بلکہ مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ خدا نے عبادت کی صرف اصلی روح اور اس کی حقیقی غایت بتا کر اس کی صورت و ہیئت سے کوئی بحث نہیں کی ہے جس سے گویا یہ بتانا مقصود تھا کہ خدا کے نزدیک اصل چیز عبادت کی کوئی مخصوص صورت نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود صرف خشیت الہی کا پیدا کرنا ہے اور اسی غایت کو پیش نظر رکھ کر رسول اللہ نے موجودہ صلوٰۃ کو قائم کیا۔

کلام مجید میں جہاں جہاں صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم دیا ہے وہاں اس سے نماز کے اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں جو اس کی ہیئت و ارکان کو ظاہر کرتے ہیں، بلکہ مقصود صرف عبادت کا قیام ہے جس کو رسول اللہ نے نماز اصطلاحی کی صورت میں ادا کیا اور اس کی ہدایت کی۔

مجھے حیرت ہے کہ میری تحریر سے لوگوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں نماز کا مخالف ہوں یا اس کو غیر ضروری قرار دیتا ہوں البتہ یہ ضرور کہتا ہوں کہ کلام مجید میں اس کے ارکان یا اس کی موجودہ ہیئت سے کہیں بحث نہیں کی گئی اور اس حقیقت کے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

رہا آپ کا دوسرا سوال کہ اذان گراموفون کے ذریعہ سے ادا کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ یہ مسئلہ بہت گھٹا ہوا ہے کیونکہ اذان خود عبادت ہے، عبادت کی تمہید ہے اور اس کے ادا کرنے میں کوئی صورت لہو و لعب کی پیدا کرنا قرین عقل و انصاف نہیں ہے۔ آج اذان کے متعلق گفتگو ہوئی ہے تو کل امام کی جگہ بھی گراموفون مشین رکھنے میں کوئی حرج نہ قرار دیا جائیگا اور اس طرح عبادت ایک تمسخر اور غیر سنجیدہ حرکت میں تبدیل ہو جائے گی۔

میں اس کا بھی سخت مخالف ہوں کہ گراموفون میں کلام مجید کے رکارڈ بھرے جائیں اور ایسے لوگوں کو جو چند درہم کے عوض ایسی سخیف حرکت کرتے ہیں یا جو ایسے رکارڈ سننا پسند کرتے ہیں نہایت ہی بُرا سمجھتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک یہ کلام پاک کی سخت توہین ہے اور کلام الہی کے متعلق ایسا جذبہ استخفاف ہے جس کو کوئی صحیح عقل مسلمان کبھی گوارا نہیں کر سکتا

مطبوعات موصولہ

پنجاب میں اردو جناب حافظ محمود خان صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور نے جو ناقذانہ تصانیف کا نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں، یہ کتاب اس مقصد کے ساتھ لکھی ہے کہ اردو زبان کی قدامت اور اس کے نشو و آغاز پر روشنی ڈالی جائے۔ فاضل مصنف نے پہلے ایک مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا ہے جسے ہم کتاب کا ملخص کہہ سکتے ہیں۔ اس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہونا معلوم ہوتا ہے اور تاریخی و لسانی اشاروں سے اس کو ثابت کیا ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے جس میں اس مقصد کو بہت زیادہ فصاحت و تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھا گیا ہے۔

پہلے لفظ اردو کی وجہ تسمیہ، لفظ ریختہ کی تحقیق اور ریختہ کی قسموں سے بحث کی ہے اور اخیر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی تھا اور اُسے گوہری بھی کہتے تھے۔

دوسرا باب اردو کے آغاز سے بحث کرتا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ اردو کیونکر برج سے نکلی، دہلی اور پنجاب کے کیا تعلقات تھے فارسی پر ہندی کا کیا اثر پڑا اور اسی سلسلہ میں انھوں نے عہد غزنوی سے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ لاہور اس وقت مرکز اسلام تھا اور اُس عہد کے اکابر شعراء و مصنفین کے حالات و خصوصیات شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا نشو و آغاز پنجاب سے ہوا۔

اس کے بعد تیسرے باب میں اکابر و اعظم پنجاب کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ اُس عہد میں یہاں کے مصنفین و شعراء نے کیا کیا تصانیف کی اور زبان سے ان کو کس حد تک کس طرح کا تعلق تھا۔

چوتھے باب میں پنجابی اور اردو کے عنوان سے لسانی تحقیق کی گئی ہے اور میری رائے میں کتاب کا اہم ترین حصہ یہی ہے اس کے بعد قدیم اردو پر پنجاب کے اثر کو دکھایا ہے اور بہت سے قدیم پنجابی شعراء و مصنفین کے تذکرہ سے اپنے دعویٰ کا ثبوت پیش کیا، الغرض موضوع کے لحاظ سے جتنے پہلو بحث کے پیدا ہو سکتے تھے ان سب پر مصنف نے نہایت فاضلانہ و محققانہ بحث کی ہے اور اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ایک شخص یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو نتیجہ فاضل مصنف نے نکالا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ ہر چند شمالی ہند کے رہنے والوں کو اور خصوصاً اہل لکھنؤ کو یہ دعویٰ نہایت عجیب و غریب معلوم ہوگا کہ اردو کا آغاز پنجاب سے ہوا۔ لیکن جس طرح اس سے قبل دکن میں اردو لکھنے والا یہ فخران لوگوں سے جھین لے گیا اور وہ کچھ نہ بول سکے۔ اسی طرح اب پنجاب میں اردو پر بھی خون کے گھونٹا پی پی کر رہا نا پڑ لگا۔ اور شاید اس سے بہتر انتقام یہاں کے اہل علم و ادب کی تنگ نظری کا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اہل پنجاب یا اہل دکن یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ انھوں نے اردو زبان میں وہ مہارت حاصل کی

جوشمائی ہندو لون کو حاصل ہے، لیکن ان میں اس فخر سے کبھی محروم نہیں کیا جاسکتا کہ اردو کا نشور آغاز انھیں کی وجہ سے ہوا اور وہ اب بھی اس کی ترقی میں کافی حصہ لے سکتے ہیں۔

جناب شیرانی نے یہ کتاب لکھ کر تاریخ زبان اردو میں ایک ایسی بیش بہا تحقیق کا اضافہ کیا ہے، اور ایک ایسا جدید راستہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

اسی سلسلہ میں، یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب شیرانی اہل پنجاب سے نہیں ہیں اور اس لئے ان پر یہ الزام قائم نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے صرف وطن پرستی کی بنا پر ایسا لکھ دیا ہے۔ ہر سنجیدہ اگر وہ پنجابی ہوتے تو بھی ان کے پیش کردہ تحقیق کے سامنے سوائے سکوت کے اور کوئی جواب نہ ہو سکتا تھا۔

اس کتاب کا مطالعہ ہر اُس شخص کے لئے ضروری ہے جو کچھ بھی زبان اردو سے لگاؤ رکھتا ہے۔ کتابت و طباعت بہت پسندیدہ ہے۔ حجم ۳۱۲ صفحات ہے۔ قیمت پندرہ روپے کا پتہ۔ انجمن ترقی اردو اسلامیہ کلج لاہور۔

مجموعہ ہے جناب آسی کے قطعات و رباعیات کا جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل دو جدا چیزیں ہیں قطعات کا **ایضامیہ** حصہ زیادہ تر ان اقوال حکماء پر منحصر ہے جو ان کو مختلف کتابوں کے دوران مطالعہ میں قابل نظم نظر آئے اور رباعیات کا حصہ خود ان کی طبعزاد چیز ہے۔

قطعات تقریباً ۱۶۰ ہیں اور سب میں کوئی نہ کوئی خیال ایسا موزون کیا گیا ہے جو اخلاق انسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کسی دوسرے کے خیال یا کسی شعر کو نظم میں ادا کرنا اور اس خوبی کے ساتھ کہ قابل کے قول کی اصل روح باقی رہے، دشوار کام ہے، لیکن جناب آسی کی کہنہ مشقی اور خوش ذوقی نے اس مشکل وادی سے گزرنے میں ان کی بڑی مدد کی ہے اور اس خوبی کے ساتھ انھوں نے ان خیالات کو نظم کیا ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی اور جگہ سے لئے گئے ہیں۔

قطعات مختلف بحور و اوزان میں ہیں لیکن کسی جگہ ان کے انتخاب میں بدذوقی ظاہر نہیں ہوتی۔ ان کی زبان جناب آسی نے اس قدر سادہ اور انداز بیان اس قدر سہل و شیرین رکھا ہے کہ معمولی پڑھا لکھا انسان بھی ان سے پورا لطف اٹھا سکتا ہے۔ اس لئے میرے نزدیک حضرت آسی کی یہ کوشش قابل داد و ستائش ہے اور حقیقی معنی میں زبان کی خدمت کھلائے جانے کی مستحق ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کو مدارس و مکاتب میں لڑکوں اور لڑکیوں کے مطالعہ کے لئے ضروری قرار دیا جائے تو ان بہت سی نظم کی کتابوں سے بہتر ہوگا جو آجکل نصاب میں داخل ہیں۔

دوسرا حصہ اسے زیادہ رباعیات پر مشتمل ہے جناب آسی اس دور کی بہترین رباعی لکھنے والوں میں ہیں اور مشکل ہی کوئی رباعی ایسی ہوگی جو معیار پر صحیح و کامل نہ اترے۔ چار چھوٹے چھوٹے مصرعون میں کسی خیال کو اس تکمیل کے ساتھ نظم کر دینا کہ جذبات کے تمام مایج و منازل اس میں آجائیں اور چوتھا مصرعہ بالکل ایک لطیفہ غیبی کی صورت سے سننے والے کے ذہن کو عقل

مین خاص لذت سرور پیدا کر دے آسان نہیں ہے۔ لیکن جناب آسی کی رباعیوں میں یہ تمام باتیں نہایت تکمیل کے ساتھ پائی جاتی ہیں جو ان کے قادر الکلامی کا بہترین ثبوت ہے۔ ان کی رباعیاں یقیناً خیام کے ناک کی نہیں ہیں اور نہ سرمد و عطار کا تتبع انھوں نے کیا ہے، بلکہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، خود انھیں کے جذبات ہیں اور اس لئے پورے جوش کے ساتھ نظم ہوئے ہیں۔ ہم یہاں چند رباعیاں درج کرتے ہیں جن سے ناظرین نگار کو ان کی خوبی کا اندازہ ہو سکیگا۔

افسانہ شوق متصل کہتا ہوں کئے سے نخل ہوں اور نخل کہتا ہوں سچا نہیں قافلہ مرے مقصد کو میں ہنگ جبرئیلؑ روں کہتا ہوں
اندھے یہ جذبات کی بے اثری اندھے یہ درد اور یہ خونیں جگری در یوزہ کے واسطے نہیں ہے کاسہ کاسہ کے لئے کرتا ہوں در یوزہ گری
اک محفل عیش میں ہو امیر اگرز دیکھا اک خشک پھول کو مجھ پر پوچھا مینے کہ کیوں جلاتے ہیں تجھے بولا کہ چن مین نہیں لیا تھا دم بھر
یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۱۰ صفحات کو محیط ہے اور طباعت و کتابت وغیرہ میں بھی کافی اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ۱۲/- مٹنے کا پتہ۔
یونائیٹڈ انڈیا پریس نیشنل و کٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔

الروضۃ البہینہ | سلاطین فاطمیہ اور بہتانات خارجیہ کے رد میں ذاکر حسین جعفر صاحب نے یہ کتاب مرتب کی اور مطبع نادری جبل پور نے شائع کی ہے۔ اس تصنیف میں شاہان بنی فاطمہ کے مختصر حالات درج کئے گئے ہیں اور ابن العذارى کے ان الزامات کا جواب دیا گیا ہے جو اسے شاہان بنی فاطمہ مصر پر قائم کئے تھے۔ اخیر میں قوم بوہرہ کی بھی مختصر تاریخ درج کی گئی ہے۔ کتابت و طباعت وغیرہ پسندیدہ ہے اور ۱۲/- میں مطبع مذکور سے مل سکتی ہے۔

سیرت و کردار | ۵۶ صفحات کا مختصر سا سالہ جس میں بچوں کے لئے چند اخلاقی و معاشری اسباق درج کئے گئے ہیں۔ کتابت وغیرہ بہت صاف اور روشن ہے اگر بچوں کے سامنے ابتدا ہی سے اس قسم کا لٹریچر پیش کیا جائے تو بڑا اچھا نتیجہ پیدا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ ہلو گون میں مطلق اس کا خیال نہیں کیا جاتا اور ایسی ناقص کتابیں پیش کر دی جاتی ہیں کہ شروع ہی سے بچوں کے دماغ میں مہلک ذوق کے برائیم پیدا ہوتے ہیں۔
یہ کتاب مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

رہنمائے تعلیم | الف۔ بے کا ابتدائی قاعدہ ہے جسے جناب شیخ چاند بھائی بی لے ماسٹر راجکمار کالج راجکوٹ نے بالکل جدید اصول پر مرتب کیا ہے۔ بچوں کے ابتدائی تعلیم کا مسئلہ بے انتہا اہم ہے اور بد قسمتی سے اس وقت تک بہت کم توجہ اس طرف کی گئی ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم کے لئے کس قسم کا نصاب مقرر کرنا چاہئے شیخ چاند صاحب نے اس قاعدہ کو کنٹرولنگ کارٹن اصول پر مرتب کیا ہے اور اس کے ساتھ ایک کلید بھی شائع کی ہے جس میں اساتذہ کو طریق تعلیم بتایا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قاعدہ بہت مفید ہے۔ اس کی قیمت معہ کلید کے ۲/- روپے رکھی گئی ہے۔

غلط فہمی | ۵۵ چھوٹے صفحات کا ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جسے جناب نصیر ام۔ اے نے لکھا اور شمس الاسلام پکٹ پبلیکارن دہلی نے شائع کی ہے۔ یہ ڈرامہ اپنی زبان اپنی طرز انشا اور پلاٹ کے لحاظ سے ایسی چیز ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص آسانی سے سمجھ پر

پہنچ سکتا ہے کہ جناب نصیرام۔ اسے اپنی قابلیت ڈرامہ نگاری کے لیے سخت مغالطہ میں مبتلا ہیں۔

اگر بلند انگریزی تعلیم کا یہی معیار ہے اور اس سے اس کا ذوق تحریر و انشاء ایک انسان میں پیدا ہو سکتا ہے، تو ہم حیران ہیں کہ ایک جاہل سے ایسے تعلیم یافتہ انسان کو کیونکر کر سکتے ہیں۔

پلاٹ صرف اس قدر ہے کہ ایک شریف خاندان کی شریف لڑکی سے جس کا نام رضیہ ہے ایک اور شریف مرد کی نسبت قرار پائی ہے جس کا نام اختر ہے اور دونوں میں محبت بھی ہے۔ ایک اور ادب باش شخص فرید جو میخوار بھی ہے اس نسبت کا مخالف ہے اور خود وہ ان شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنی غرض پوری کرنے کے لئے وہ پہلے تو ڈاکہ مار کر مال حاصل کرتا ہے اور پھر رضیہ کو ایک گمنام تحریر بھیجتا ہے کہ اختر بد چلن میخوار ہے اور پھر ایک صحبت بادہ مرتب کر کے اس میں دھوکہ سے اختر کو شریک کرتا ہے اور رضیہ اسی وقت نقاب پوش ہو کر آتی ہے اور اختر کو اس مجلس میں دیکھ کر بد گمان و متنفر ہو جاتی ہے۔ چند دن تک یہ حالت رہنے کے بعد راز کھل جاتا ہے، فرید گرفتار ہوتا ہے اور اختر کے ساتھ رضیہ کی شادی ہو جاتی ہے۔

یہ پلاٹ ہے ایک انتہائی تعلیم یافتہ کے دماغ سے نکلا ہوا جس کی ترتیب میں ہر وہ بند و تابی جو پیدا ہو سکتی ہے موجود ہے۔

مکالمہ کی زبان اس قدر سوجھ بوجھ سے گزاری ہے کہ صرف جامع مسجد کی سیڑھیوں ہی پر سنی جاسکتی ہے رضیہ کا جو کیر کرائی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے وہ بھی نہایت ہی معمولی اور شرافت سے گرا ہوا ہے۔

الغرض یہ ادبی کوشش جناب نصیر کی اسی لٹریچر میں شامل کی جاسکتی ہے جسے انگریزی میں "Gilded Prose" (نابرابری کا دار کہتے ہیں اس کی قیمت ۸ روپے لکھی گئی ہے) ڈرامہ کا ایک بدترین نمونہ دیکھنے کے لئے زیادہ نہیں ہے ڈرامہ کا نام "غلط فہمی یقیناً بہت موزون ہے کیونکہ مصنف نے واقعی اپنی قابلیت کے متعلق سخت غلطی فہمی میں مبتلا ہو کر اس کو تحریر کیا ہے۔

دیوان ہے جناب سردار عطا محمد خان صاحب درو کا بونیا ورتانی اور موٹا نقد باری ہیں۔ فی الحال آپ کا قیام گجرات میں ہے اور وہیں سے یہ دیوان شائع کیا گیا ہے۔

اس دیوان میں جس شاعری کو پیش کیا گیا ہے وہ اس قدر عجیب و غریب چیز ہے کہ مشکل سے اس زمانہ میں اس کی دوسری مثال سوائے دیوان شادان کے کوئی اور نظر آسکتی ہے۔ میر کی شاعری یکسر تشام (Pessimism) شاعری ہے اس لئے

موجودہ دور انحطاط میں اس کا مطالعہ مناسب نہیں، غالب کے سمجھنے کے لئے جو وقت صرف ہوتا ہے اس کا استعمال دوسرے مفید کاموں میں ہونا چاہئے۔ جان صاحب کا مطالعہ انسان میں انسانیت پیدا کرتا ہے، جعفر زل، بے غیرتی کا درس دیتا ہے اور حیرت انگیز عقونٹ و غنایان کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی ایسا کلام مطالعہ میں رہے جو ان تمام باتوں سے علیحدہ ہو کر وجہ تفریح نہایت ہو اور میرے نزدیک یہ مقصد اس دیوان سے پورا ہوتا ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

میر کا دیدہ لگن بن گیا چھوٹے جس نے گیسو کے مشکین تھے سرسودہ مشک ختن بن گیا

دیدہ دل کا پھیل کر لگن ہو جانا اور انسان کا از سر تا پا مشک ہی مشک بن جانا کس قدر جدید تخیل ہے۔
 دیکھ لے گل نہ کر تہا ہی جانچ تو نے رہنا ہے چار دن یا پانچ خار سینہ میں بھی لگے اس کے جس نے دل میں مرے لگائی آج
 پہلے شعر بے بٹائی کا نقشہ جس موثر انداز سے کھینچا گیا ہے وہ صرف جناب درد کا حصہ ہی اور دوسرے شعر میں عاشقانہ نیاز
 و فتادگی کے مقابلہ میں درس خود داری یا گیا ہے جو ہر انسان کا فطری حق ہے۔
 ہرگز نہ آپ صنیٰ ہر طرف رغبتی میں بیگم میں ہر جو خاصہ پایا نہ دیتی میں شب کو رقیب سے مہ ملنا ہی ناچ گھر میں اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں
 پہلے شعر میں معاشرت کے تعمیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اور دوسرے میں تخریبی پہلو کو۔
 بے نیازی کے تھے صدقہ تپا میں ہوں اور توٹے باغ سے کوئی ناز زندگی ہند میں نایاب ہوئی عمر گران شیر کو چل کچھ گز ایں چین دن در دیار زندگی
 پہلے شعر میں محبوب کی جوانی کو ناز زندگی کہنا اور دوسرے شعر میں درد در دیار زندگی کی ترکیب دینے مستغنی ہے
 بعض مشکل ردیف و قوافی میں ایسے ایسے شعر کا ہے ہیں کہ باید و شاید مثلاً:-

مسقط کا نہ لاشیخ تو حلو امر آگے رہنے ہی دے کلفام کے پہلے آگے
 مرگان بخت کا حال سنا جب چھو کہ سے سینہ پہ چھید گیا مرا اور دل بھی دوک سے
 اس کے فراق و عشق میں میرا ہے زرد رنگ خون چوسنے میں کم نہیں دبیر زوگ سے
 کوئی بھی جانتا نہیں اس کے سب علوم عاجز ہیں کل فلاسفہ بے بس ہیں بی فہوم
 بہر بتان شراب و کباب و رباب و چنگ ہے عاشقوں کے واسطے دنرات یاں قوم
 شب کو اٹھا کے لیگیا کوئے بتان میں ل آیا نہ باز حیف خصومت سے یہ خصوم
 حاسد ہے کیا یہ درد کا ہے ہمد مو عجیب دل میں ہے یا مخصوص تو پہلو میں بالعموم
 سوز فرقت کی لگ گئی ہو آگ تم بچھاؤ تو میرے جاگین بھاگ نابش حسن نے تری خورشید منہ سے عاشق کے ہے بھائی جھاگ
 خوش نصیبی ہے آجکل اس کی جس کو ملتی ہے دال روٹی ساگ
 صدمہ ہاے درد سے دل ہو گیا ہے پاش پاش آپ ہو کیا اس کا مداوا تو بتا دے تاش تاش
 درد و غم نے کر دیا ایسا نحیف و ناتوان اندون بھر ہو گئی میری غذا ہے آتش آتش
 گر نہیں صاحب تمھارے دل میں کچھ کر دوسرا کیون بھلا خلوت سرا کا بند کرتے ہو کوار
 ہو سکے گی کس طرح ان کی رست اسے تو درد ہجران سے بڑے ہیں خانہ دل میں دبا
 مست بازار و دنیا میں جو بھرتا ہے ساند والدہ اُسکی ہے گھر میں ایک راند
 ایک دم جاتے رہے عیش و طرب درد نے آکر دیا جب دل کو ماند

فارسی کی بھی ایک غزل جناب درمنے تحریر کی جس کے بعض شعر یہ ہیں :-

چون بہ پورب رنم و ایر شدم بہ زبان مغربی تا در شدم
یا فتم ہر اوج جاہ و منزلت چون بہ بزم دوستان حاضر شدم
چون نمودم نکتہ ہائے فلسفہ از خطاب مغربی تا فر شدم
چون عروسے خوبرو ہر شعرین میباش بہر قلب را ساغر شدم

یہ مجموعہ لطائف مصنف سے یادوکان شیخ الہی بخش رحیم بخش تاجران کتب گجرات سے ہم میں مل سکتا ہے۔

کوئی صاحب بغیر اجازت تحریر ہی مصنف اس کو طبع نہیں فرما سکتے اور اگر کسی جلد میں مصنف کا ذکر ہو تو اس کو مال سرزد سمجھنا چاہئے۔ میں نے بھی اس کا اظہار اس لئے کر دیا کہ حلقہ نگارین کو صاحب طبع زمین اس دیوان کو طبع کرانے کا قصد نہ کریں، ورنہ ”بجائے نفع کے نقصان“ اٹھائیں گے، اور مصنف بھی اس کو گوارا نہ کرینگے کہ ان کے جواہر ریزے ملک عام ہو کر رہ جائیں۔

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں جناب ابو ظفر مودید الدین حسن صاحب مددگار ناظم کورٹ آف واٹر ذحیدر آباد نے **موید السلیں** چند اسباق توحید و رسالت، نماز و روزہ حلال و حرام، نکاح و طلاق وغیرہ کے درج کر دیئے ہیں۔ رسالہ بہت صاف و سلیس زبان میں ہے اور عورتوں اور بچوں کی ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں اس کو سب سے پہلے پڑھا دینا ضروری ہے طباعت و کتابت صاف و روشن ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مکتبہ ابراہیمہ اسٹیشن روڈ ذحیدر آباد دکن سے مل سکتا ہے۔

شہاب کی سرگزشت

جناب نیاز فتحپوری کا وہ معرکہ الآرا افسانہ جو سیرۂ نگاری نفسیاتی تحلیل، بلندی خیال زورِ تحریر، ندرت بیان نزاکت تخیل اور قوت انشاء کے لحاظ سے ادبِ دوہین ایک بالکل نئی اور نادر چیز ہے، اول بار اسکا مطالعہ انسان کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے، دوسری بار اسکا مطالعہ حقیقتِ تہرک کے دوسری مرتبہ کے مطالعہ کے بعد انسان کے لذات میں بالکل غرق ہوتا ہے۔

اگر پسند نہ ہو تو مطالعہ بعد پسند کیجئے اور اپنی قیمت لے لیجئے۔
مہمہ محمول (پیر امین بلیکار) مینجر دنگار۔ لکھنؤ

تذکرہ خندہ گل میں

کس کس شاعروں کا حال و روز خباب کلام ورج ہے

اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ایک کارڈ ڈال دیجئے

ہم آپ کو مکمل فہرست چھپی ہوئی بھیج دیں گے

اس کو دیکھ کر آپ خود فیصلہ کر لیں گے کہ اس سے

قبل کوئی تذکرہ اس موضوع کے لحاظ سے اتنا

بسیط و مکمل شائع نہیں ہوا۔

مینجر دنگار، لکھنؤ

بهاریه

رسید موکب نور و زرد چشم فتنه غنود
 کنون که بر شد آواز مرغ از بر مرغ
 بکتف دشت یکے جو شنیست مینا فام
 سپهر گوهر بار دہی بہ مینا د رع
 شکستہ تاج مرصع بشاخہ بادام
 تل شقیق، بانند مقتتی است شریف
 بطرف مرزبر، آنالہ ہائے نشگفتہ
 بروی آب نگہ کن کہ از قطا ول باد
 ہزار طہرفہ ز آثار پاستان یابی
 صنیع آذرینی و حجت ز ترشت
 بہر کہ برگزری شادی یزد در دل
 یکیست شاد بہ سہم و یکیست شاد بزر

درود باد، مرین موکب نجستہ درود
 شنید باید آوازے رود برب لب رود
 بفرق کوہ یکے مغفریست سیم اندود
 سحاب، بولوپا شد ہی بسیمین خود
 شکستہ عقد گہر بر شاک شفتا لود
 درخت سرو، بانند گنبدیست کبود
 چنان بود کہ سر نیزہ ہائے خون آلود
 چنان بود کہ، گہ مکرمت جہین جہود
 کجا بخواہی، کائے دو باغ راہیمود
 گواہ موسی یابی و معجزہ دادود
 ہرچہ در نگری، اندہی کند بد رود
 یکیست شاد بچنگ و یکیست شاد برود

ہمہ بچیزے شادند و خر مند و لی
 مرا بخرنی ملک شاد باید بود

صبح - راوی کے کنارے!



یہ صبح کا وقت، اور یہ راوی کا کنارہ! وجد آور و صد کیف بہ امان ہے نظار
فطرت نے ہے کس ذوق سے دریا کو سنوارا
بکھرا ہوا ہے چار طرف حسن فراوان! میدان میں سارے! راوی کے کنارے!
بکھرے ہوئے موتی ہیں کسی زہرہ جبین کے کھوئے ہوئے منظر ہیں کسی خواب حسین کے
نگارے ہیں مگر کیف گمہ خلد برین کے
یارند ہیں میخانہ افلاک میں لرزان! یہ ڈوبتے تارے! راوی کے کنارے!
راوی کے کنارے کی یہ خاموش فضا ہیں! بیتاب کنان ہجر در آغوش فضا ہیں!
رنگینی فطرت سے صنیا پوش فضا ہیں!
یہ صبح طرب ریز، لب رود حسد امان یہ مست نظارے! راوی کے کنارے
فردوس کی موسیقی سے لہریز ہے دریا یا خلد کے نغموں سے جنون خیز ہے دریا
یار قص سے حورون کے طرب ریز ہے دریا
خوین! جو ہیں آغوش میں راوی کے خرا مان دلکش ہیں نظارے، راوی کے کنارے
لیکن ہے غم آلود یہ موسیقی رنگین نغمات میں راوی کے ہے روداد غم آگین
موجوں کے تبسم میں ہے اک گریہ خونین!
اور ”عہد گزشتہ“ کی طرف لہرون کا ہیجان کرتا ہے اشارے! راوی کے کنارے
رنگ ”مئے پارینہ“ سے شاداب ہے راوی اُس ”عشرت برباد“ کا اک خواب ہے راوی
اُن ”مخفلون“ کی یاد میں بے تاب ہے راوی
ہاں، یا وہاں گیر میں راوی بھی ہر گریان

”راشد علی پوری“

مقبرہ ہمایون

نکھتِ رمیدہ غنچہ کے برگِ جگر فگار اک نازنین کے جذبہ الفت کی یادگار
 اے تاجِ ہند کے صدفِ دُڑ آبدار
 اے آسمانِ جاہ کے بے نورما ہتّاب اے شاہِ جمال کے اُترے ہوئے شباب
 عبرتِ سراے دہر کی تصویرِ بے نقاب
 تو نغمہٴ خموش ہے نا آشنائے چنگ وہ صحنِ گلکدہ کہ جو ہو بے نیاز رنگ
 وہ تیغِ جس کے منج پہ پڑی ہو نقابِ رنگ
 وہ سنگِ جس کے دلمین ہو نہانِ جمالِ طو وہ قطرہ جس کے سینہ کے اندر ہو بحرِ نور
 وہ ذرہ جس کے لپٹن سے ہو مہر کا ظہور
 وہ طوقِ جس میں بسمل تیر قضا ہو قید وہ دامِ جس میں طائر شیرین نوا ہو قید
 یا وہ قفس کہ تاروں میں جکے ہما ہو قید
 اے چشمِ مضطرب یہ کچھ کیا ہوا کہ تو ہے آج اس مزار پہ سر گرم جستجو
 کیوں اے لبِ خموش یہ کیسی ہے گفتگو؟
 اک جنبشِ نگاہ سے تربت اُچھا لدی اُف! آرزوے مردہ حین پھر جانِ ڈال دی
 محمود تو نے نقشِ ہمایون نکال دی!!

”محمود۔ اسرائیلی“

”شکوہ تغافل“

بھولنے والا مرا ہر وقت مجھ کو یاد ہے مین تو ہوں ناشاد لیکن بھول کر وہ شاد ہے
 سنگدل کہتے بھی دُرتا ہوں اُسے صدمہ نہ ہو مجھ سے ہو سکتی نہیں فریاد بھی فریاد ہے
 (قاضی محمد مرید صاحب روبرو آباد)

آزادی

تو کیا شے ہے اے آزادی
تیرے نام کا شیدائی ہوں
آنکھ سے سیل اشک ان ہوں
ابنی کہانی کس کو سناؤں
آنکھ کھلی صیاد کے گھر میں
یاد بھی مجھ کو اب نہیں آتا
غنیہ خاطر کھل نہ سکاؤں
جب ذوق پرواز دیا تھا
زہر ہوا ہے رنج اسیری
خون ہوا ہے دل سینے میں
عالم میں بیکار سی شے ہوں
رونا میرا رنگ دیدہ
نقش سجدہ داغ جبین ہے
جو آزاد ہیں شاد وہی ہیں
عیش اُنکا آرام اُن کا ہے
اے آزادی تو کیا شے ہے
تو عالم کی روح روان ہے
رو و آب روان ہے تجھ سے
ساز و بن میں آواز ہے تجھ سے
دام میں پروانہ گر ہوتا
عشق و دین و مذہب تجھ سے
زہر بھی ہے کچھ جام میں شے

تیرے غم نے آفت ڈھادی
تیرے شوق کا سودائی ہوں
لب پر ہر دم آہ و فغان ہے
کس کو داغ سینہ دکھاؤں
دہر قفس ہے میری نظریں
تھا بھی نشیمن یا کہ نہیں تھا
سعی کا سامان مل نہ سکاؤں
یارب کیوں پابند کیا تھا
حد سے گزری بے توقیری
اب کیا رکھا ہے جینے میں
ختم میں گویا درمے ہوں
دست دعا ہے دست بریدہ
میری عبادت دشمن دین ہے
شاد وہی آباد وہی ہیں
ہستی اُن کی نام اُن کا ہے
میں تو زندانی ہوں ہے
بزم فنا کی شمع جان ہے
موج باد و ان ہے تجھ سے
چڑیوں میں پرواز ہے تجھ سے
شمع سے واصل کیونکر ہوتا
دنیا عقبے ہے سب تجھ سے
دھوکا بھی ہے نام میں تیرے

دیکھی نہیں ہے صورت تیری
دل ہے مشتاق نظارہ
نام تیرا میں جب سنتا ہوں
میرا کوئی یار نہیں ہے
آہ بہار چمن کیا جانوں
نشو و نما ہونے نہیں پائی
مجھ کو ملے تھے جتنے جوہر
گر یہ بال و پر ہی نہ ہوتے
کوئی نہ پوچھے اب میں کیا ہوں
اک اک پل بھاری ہے جینا
میرا وجود ہے باز ہستی
جوش عشق فریپل ہے
عشق ہے حیرت کا طالب
عاشق وہ ہیں عامل وہ ہیں
مالک اس دنیا کے وہ ہیں
تیرا از جنہوں نے جانا
جب تو نے صورت دکھائی
تجھ سے نشو و نما ہے بن میں
تجھ سے خون تن میں روانی
گردیدار آزاد نہ ہوتے
کتے ہیں لیکن یہ بھی مبصر
مطلق آزادی تو جنوں ہے

پھر بھی ہے یہ حالت میری
غم سے جگر ہے پارہ پارہ
بتا بانہ سر دھنستا ہوں
ہمدرد و غمخوار نہیں ہے
میں لطف گلشن کیا جانوں
پیدا ہوتے ہی موت سی آئی
رہ گئے دل کے دل میں بکر
تو پرواز کو ہم کیوں روتے
اُن زندہ در گور ہوا ہوں
جینا خون جگر ہے پینا
جیتا رہنا عار ہستی
میرا عہد وفا باطل ہے
ذوق عمل و سنت کا طالب
ہر پہلو سے کامل وہ ہیں
بندے اپنے خدا کے وہ ہیں
کتے ہیں وہ عاقل و دانا
شمس و قمر میں گردش آئی
جوش گل سخن گلشن میں
تجھ سے دل میں جوش جوانی
دیر و حرم آباد نہ ہوتے
کرتی ہے گمراہ تو اکثر
عقل کا کھونا کارز یوں ہے

یہ مانا آزاد ہے عالم { لیکن دیکھیں غور سے گریہ
 ہین سارے اجزائے فطرت { ہین پابند جذبِ باہم
 نظم عالم کا سامان ہے { اس آزادی کو روتا ہوں
 جب امین بہت بیکل ہوتا ہوں { پابندِ اخلاق و محبت
 ہو میرا ہر جز و طبیعت { عشق گلشنِ روح روان ہو
 کار و فسا ایمانِ جان ہو

جگر بریلوی

نثرانہ دل

مری نمود کفِ خاک سے ہے وابستہ وہ نشہ ہوں کہ رگِ تاک سے ہے وابستہ
 مین ہوں تو نخل بہ آغوشِ دانہ مین لیکن مری نمود گلِ نمناک سے ہے وابستہ

خود می پرست بھی ہوں مین خدا پرست بھی ہوں مین اپنی آپ ہی تعمیر بھی شکست بھی ہوں
 مرے تضاد سے رونق ہے بزمِ ہستی کی مین ہوشیار بھی ہوں اور سیاہ مست بھی ہوں

خمِ سفال اتنا یاد ہے نے سرور ہے تو بذاتِ خود ہے گلِ تیرہ بے شعور ہے تو
 مرے ظہور سے تابان ہے ذرہ ذرہ ترا مری نمود سے اے مشیتِ خاکِ بطور ہے تو

امین حزمین

غزلیات

اختر شیرانی :-

بی وفا کو عبث الزام جفا دینا تھا!
حسن و الفت میں نہیں تفرقہ فرد و دوئی
ہم ہی بھوئے کہ تجھے دل سے بھلا دینا تھا!
جذب کا مل کو یہ پردہ بھی اٹھا دینا تھا!
دل سے نقشِ غم ہستی کو مٹا دینا تھا!
یہ تماشا بھی کبھی اُن کو دکھا دینا تھا!
ہو کے ناکام، ہو س کار بنے کیون اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا!

اثر رحمانی راپوری :-

خدا سر سبز رکھے گلستانِ حسنِ جانان کو
جہان تک چھپ سکا دل میں چھپا یا رازِ بہان کو
تصور ہی میں ہم بھر لیتے ہیں پھولوں سے دامن کو
مگر کیا کیجئے اس دیدِ خوننا بہ افشان کو
پیشمان کیا کرے گا عشقِ حسنِ نا پیشمان کو
اثر گھر سے نکل کر بھی نہ وحشت کم ہوئی دل کی
بیابان میں کبھی پہنچا کبھی دیکھا گلستان کو

مناقب جالندھری :-

مرے دل کو ہے ان کے حسنِ عالمگیر کی خواہش
اگر پوری نہ کرنی تھی نہ کرتے پوچھ تو لیتے
خدا کی شان ہے ذرہ کرے تنویر کی خواہش
کسی نا کام کی حسرت کسی دلگیر کی خواہش
لئے جاتی ہے زندان کی طرف زنجیر کی خواہش
نشاط انگیز ہے کیون ناخن تدبیر کی خواہش
جہان لے جائے رنگِ عالم تصویر کی خواہش
یہ مرگ دزلیست کے ہنگامے گذرین تو وہاں گذرین

ابھی تک عالم بیم ورجا کی کشمکش میں ہوں
خدا جانے دکھائے کیا مجھے تقدیر کی خواہش

شوق مراد ابادی :-

وعدہ کیا ہے آپ نے آنے کا خواب میں
ہر جنبش نگاہ پہ گھبرا رہا ہے دل
تھیں کس کی چشم مست میں کل میفروشیان
رنگ پریدہ رخ عاشق گواہ ہے
دل ہے فریب خوردہ طرز وفائے دوست
سوزِ غم فراق سے رگ رگ تپیدہ ہے
اب کام کیا بھلا مری آنکھوں میں خواب کا
مورد ہو کون دیکھئے ناز و عتاب کا
کسے پلا دیا ہمیں ساغر شراب کا
یارب! کسی کی برہمٹی بے حساب کا
یرسان ہو کون اب مرے حالِ خراب کا
کیا خوفِ حشر میں پیش آفتاب کا
اسے شوق سر برانولے غم ہوں تمام رات
کیون راز فاشش ہو دل پر اضطراب کا

عشرتِ رحمانی :-

ضبط کی تاب نہیں، طاقتِ فریاد نہیں
اب جہان چاہے مجھے خانہ خرابی لیجائے
پردہ ہائے حرم و دیر اٹھے ہین لیکن!
انتہا یہ ہے کہ جینے کا نہیں ہوش مجھے
اور تسکین کا پہلو بھی مجھے یاد نہیں
خود فراموش کچھ ایسا ہوں کہ گھریا دہن
سجدہ عشق سے آگے مجھے کچھ یاد نہیں
ابتدا کیا ہوئی اُفت کی یہ کچھ یاد نہیں
کیا شکایت کریں عشرت کہ بقول غالب!
ہمکو بے مہرئی یا ران و طن یا دہن!!

نظیر لودھیانوی :-

شبِ غم زبان سے یارب کبھی وہ صدا نہ نکلی
ہے فروغِ ماہِ شب بھر ہے بہارِ باغِ دودن
جو سکون کسی قدر ہے تو فوراً یا بس سے ہے
جسے سُن کے خواہ گہ میں کوئی بے قرار ہوتا
تری دوستی پہ کیونکر مجھے اعتبار ہوتا
جو اسیدِ وصل ہوتی تو کسے قرار ہوتا

اسے رائیگان نہ سمجھو یہ نفس عجیب شے ہے
 غم عشق وہ بلا ہے کہ جو مہر و مہ نہ ہوتے
 غم کجبر میں بھی آتا مجھے لطف زندگی کا
 ترے غم میں جان دیدی تو یہ کونسی خطا کی
 مرا خو پچکان فسانہ اگر ایک بار سنتا
 تب و تاب عشق رکھتے تو یہی شرار ہوتا
 تو فلک پہ شعلہ بن کر یہ غم آشکار ہوتا
 مئے خوشگوار ہوتی لب جو لبیاں ہوتا
 کسی در پہ سر جھکاتا تو گناہگار ہوتا
 کوئی دہرین سکون کا نہ امیدوار ہوتا
 جو نظیر اس کے دل میں نہ خدا نے رحم ڈالا
 تو مجھے ہی میرے دل پر کوئی اختیار ہوتا

معلومات

حقائق طبیعی کے بعض عجائب | ایک پونڈ پانی کو جوش دیجئے تو معلوم ہو گا کہ جب قدر وزن اس کا نقطہ انجماد پر تھا اس سے کچھ زیادہ ہو گیا ہے، لیکن یہ زیادتی پونڈ سے زیادہ نہ ہو گی۔ اسی طرح جب پانی غلیانی حالت سے اتر کر نقطہ انجماد پر پہنچتا ہے تو اس کا وزن پونڈ کم ہو جاتا ہے حالانکہ اس کا حجم بڑھ جاتا ہے۔

اسی طرح جب آکسیجن اور ہیڈروجن دو گیسوں پانی کی مقدار معین بنانے کے لئے باہم ملتی ہیں تو ان دونوں کا وزن پانی سے زیادہ ہوتا ہے اور یہ زیادتی ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب پانی سرد ہوتا ہے تو حرارت کے ذریعہ سے کوئی چیز اس سے کم ہو جاتی ہے اور جب آکسیجن ہیڈروجن ملتی ہیں تو وہ حرارت جو باہم ملنے سے قبل ان میں پائی جاتی تھی مفقود ہو جاتی ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں جسم سے قوت کا کچھ حصہ زایل ہو جاتا ہے اور قوت کے لئے جرم اور جرم کے لئے وزن ضروری ہے۔

ریاضی کے حسابات دقیقہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آفتاب ہر ثانیہ میں ۴۰۰ ملین ٹن مادہ شعاؤں کے ذریعہ سے خارج کرتا رہتا ہے۔ اور اصولاً اس سے جرم شمس میں کوئی نقص پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اگر اسی بے شمار مادہ سال تک برابر اپنا مادہ ضائع کرتا رہے تو اس کے جرم اور قوت کشش کو لاکھوں حصہ سے بھی کم نقصان پہنچے گا۔

کہربائی آنکھ اور اس کا استعمال | جس وقت آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور افق میں تاریکی پیدا ہو جاتی ہے اُس وقت اگر کسی کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو آنکھوں کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ اس زحمت کو دور کرنے کے لئے امریکہ کے مدارس نسوان کی مہتمم عورتوں نے تعلیم پانے والی لڑکیوں کے لئے کہربائی آنکھ کا استعمال شروع کیا ہے۔

کہربائی آنکھ کا ذکر اس سے قبل نگار کے باب معلومات میں آچکا ہے۔ یہ ایک کہربائی بیٹری ہے جو طبیعی روشنی کو جذب کر کے برقی رو میں اسے تبدیل کر دیتی ہے۔

مدرسوں کے کھڑکیوں میں یہ آئہ رکھ دیا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے فضا کے روشن جردن کے ایک ایک گوشہ میں پہنچتی ہے اور رات کو بغیر برقی روشنی کے مدد سے اس کے ذریعہ سے مطالعہ ہو سکتا ہے اس آئہ کا ایک طبی فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ مکان کے جن حصوں میں آفتاب کی روشنی بہ آسانی نہیں پہنچ سکتی وہاں اس آئہ کے ذریعہ سے بخوبی روشنی پہنچ سکتی ہے اور تاریکی کے مضر اثرات سے مکان کے رہنے والے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

پتھر کے ملبوس | اسبستوس ایک قسم کی معدنی سنگین چیز ہے جس میں ریشے پائے جاتے ہیں اور آگ کو قبول نہیں کرتے۔ فلاڈلفیا کے ایک ماہر کیمیا نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ اس سے کپڑا تیار کرنے والا ہے جو ریشم کی طرح نرم ہوگا لیکن نہ اس پر تیزاب کوئی اثر کر سکے گا اور نہ آگ اسے جلا سلیگی۔

پروفیسر ندکور کا بیان ہے کہ قدیم روم میں اس کے لباس کا رواج پایا جاتا تھا لیکن اس طرح کہ ریشم کے تاگون کے ساتھ اس کے تاروں کو بھی ملا دیتے تھے اور یہ کپڑا کفن کے لئے مستعمل ہوتا تھا۔

اسی طرح سترھویں صدی میں چین کے تاجر اس کے مندلیوں کی تجارت کرتے تھے۔ مدعا یہ کہ اسبستوس کے کپڑے تیار کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن اس کا کپڑا ایسا صاف بن سکتا تھا کہ عام طور پر اس کا رواج ہو جاتا۔ اب پروفیسر ندکور نے اس کو ایک بہترین خوشنما کپڑے کی صورت میں تبدیل کرنے کا ارادہ کیا ہے جو عام کپڑوں سے ارزان بھی ہوگا۔

اگر اس میں واقعی کامیابی حاصل ہو گئی تو پانچسٹر کو امریکہ کے مقابلہ میں ایک بالکل نئی مصیبت سے متصادم ہونا پڑے گا۔ اس وقت معدنی اشیاء میں ریڈیم سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہے اور علاج امراض میں اس سے بہت کام لیا جاتا ہے لیکن حال ہی میں اس سے اور کام لیا جانے لگا ہے یعنی روس کے پائے تخت لیننگراڈ میں ایک کارخانہ

ریڈیم کا جدید استعمال | ریڈیم کے کپڑے تیار کرنے کا ہے وہاں اس سے حفاظت آتش کا کام لیا جاتا ہے۔

چونکہ ریڈیم کے کارخانوں میں آگ لگنے کا بہت احتمال ہوتا ہے اور بسا اوقات بجلی کے تاروں سے آگ کی چنگاری نکل کر گودام کے گودام تباہ کر دیتی ہے، اس لئے ریڈیم کا استعمال کیا جاتا ہے تاکہ آگ کے حادثے رونما نہ ہوں۔

ریڈیم کا یہ بھی ایک خاصہ ہے کہ وہ بجلی کی مجتمع قوت کو آہستہ آہستہ فضا میں منتشر کر دیتا ہے اور نقصان کے احتمال کو دور کر دیتا ہے۔ اس لئے انھوں نے ریڈیم لگا دیا ہے جس سے بجلی کے تاروں میں آگ پیدا ہونے کا احتمال نہیں ہوتا۔

۱۲	پرتاب	۱۸	میرۂ تلخ	۱۸	حکایات و حقاہات	۱۸	سیاحت زمین	۱۸	مراثی مونس	۱۸	کلیات مومن
۱۰	ردہنی	۱۸	نیک کا بھیل	۱۸	دکھ پانی جانی	۱۸	سیاحت	۱۸	مراثی دلگیر	۱۸	دیوان ناسخ
۱۸	مولانا شرم مرحوم	۱۸	شوق قدوائی مرحوم	۱۸	سراب فیش	۱۸	نازنین مراکش	۱۸	تذکرۃ الشعرا	۱۸	کلیات میر
۱۸	جنید بغدادی	۱۸	ترانہ شوق	۱۸	بالشوک شہزادی	۱۸	سمندر کی سیر	۱۸	تذکرۃ حسینی	۱۸	کلیات سودا
۱۸	ملکہ زونبہ	۱۸	قاسم دہرہ	۱۸	شہید وفا	۱۸	اسرار بالشوئزم	۱۸	گلشن	۱۸	کلیات انشا
۱۸	قرۃ العین	۱۸	نیرنگ جمال	۱۸	ممتاز بیگم	۱۸	روح لیلی	۱۸	سراپے سخن	۱۸	کلیات نظیر اکبر آبادی
۱۸	محدثات	۱۸	میرولی اللہ بی لے	۱۸	شعلا رنگین	۱۸	امین بک	۱۸	سوانح نظیر اکبر آبادی	۱۸	گلزار داغ
۱۸	جویاے حق	۱۸	بندگی	۱۸	محاصرہ پیرس	۱۸	حجاج بن یوسف	۱۸	دیوان فارسی	۱۸	دیوان رند
۱۸	لعبت چین	۱۸	کاس الکرام	۱۸	شیخ چلی	۱۸	یوسف پاشا	۱۸	دیوان شمس تبریز	۱۸	دیوان ذوق
۱۸	قاسم مفتوح	۱۸	لسان الغیب جلد اول	۱۸	بہادر ترک	۱۸	انقلاب عثمانی	۱۸	کلیات عراقی	۱۸	کلیات اسمعیل
۱۸	بابک خرمی	۱۸	دوم	۱۸	بہرام کی دہلی	۱۸	نیلی چھتری	۱۸	دیوان حافظ	۱۸	مرآۃ القیب
۱۸	الفاسو	۱۸	چارم	۱۸	انقلاب فرانس	۱۸	بہرام کی آزادی	۱۸	دیوان نعمت جان عالی	۱۸	صنمخیاہ عشق
۱۸	ایام عرب	۱۸	شہد ان فصاحت	۱۸	حسن بنارس	۱۸	بہرام کی سرگزشت	۱۸	کلیات انوری	۱۸	فریاد داغ
۱۸	قیس و لبنی	۱۸	بادۂ ناب	۱۸	نظری جاسوس	۱۸	بہرام کی سرگزشت	۱۸	دیوان بے دل	۱۸	دیوان قاتل
۱۸	یوسف و یحییٰ	۱۸	ظفر عمر بی لے	۱۸	ٹوکی حرم سرا	۱۸	ادبی کتابیں	۱۸	کلیات سعدی	۱۸	دیوان شہیدی
۱۸	زوال بغداد	۱۸	چور دن کا کلب	۱۸	جنگ طربنس	۱۸	کمل شرح دیوان غالب	۱۸	دیوان عرفی	۱۸	عجائب غرائب
۱۸	مینا بازار	۱۸	نیلی چھتری	۱۸	بہرام چور	۱۸	بزم خیال	۱۸	کلیات جامی	۱۸	عجائب المحدثات تصویر نگین
۱۸	مقدس نازنین	۱۸	بہرام کی گر قاری	۱۸	زیر پست	۱۸	مشاطہ سخن	۱۸	کلیات غالب	۱۸	عجائب المحدثات تصویر نگین
۱۸	رویت الکبریٰ	۱۸	مولانا نیاز فتح پوری	۱۸	کنجی کاراز	۱۸	انشاء انسان	۱۸	کلیات صائب	۱۸	با تصویر سادہ
۱۸	خلیانا	۱۸	گیتان چلی	۱۸	عبدالرحمن ناصر	۱۸	مکاتیب حسن الملک	۱۸	کلیات حزمین	۱۸	جمع الفنون
۱۸	شوقین ملک	۱۸	گوارہ تمدن	۱۸	عروس مصر	۱۸	لیلیا مجنون ڈراما	۱۸	دیوان عنصری	۱۸	طلسم فرنگ
۱۸	منصور موہنا	۱۸	نگارستان	۱۸	سیلاب خون	۱۸	مراثی	۱۸	دیوان غنی کشمیری	۱۸	کارخانہ عالم
۱۸	حسن انجیلنا	۱۸	صحابیات	۱۸	کرشمہ	۱۸	مراثی دبیر	۱۸	دیوان غنی کشمیری	۱۸	زنا لڑکے ناو لڑکے ترجے
۱۸	ملک عزیز و جانا	۱۸	تاریخ الدولتیں	۱۸	وفا دار و لہن	۱۸	مراثی انیس	۱۸	دیوان ہلالی	۱۸	الدین دلسلی
۱۸	فردوس برین	۱۸	سید سجاد علی لے	۱۸	طواف زمین	۱۸	مراثی ضمیر	۱۸	کلیات جلال سیر	۱۸	فریاد حسن
۱۸	حسن کا ڈاکو	۱۸	زہرا	۱۸	حلال الدین خوارزم شاہ	۱۸	مراثی ضمیر	۱۸	دیوان حسن دہلوی	۱۸	سوزن عشق
۱۸	در بار حرام پور	۱۸	خیالستان	۱۸	نالت بخیر	۱۸	مراثی ضمیر	۱۸	کلیات ظفر	۱۸	روز الیمبرٹ
۱۸	غیب دان و لہن	۱۸	نالت بخیر	۱۸	نالت بخیر	۱۸	مراثی ضمیر	۱۸	کلیات ظفر	۱۸	نازل اسرار
۱۸	بدر النساء کی مصیبت	۱۸	نالت بخیر	۱۸	نالت بخیر	۱۸	مراثی ضمیر	۱۸	کلیات ظفر	۱۸	شام جوانی
۱۸	بدر النساء کی مصیبت	۱۸	نالت بخیر	۱۸	نالت بخیر	۱۸	مراثی ضمیر	۱۸	کلیات ظفر	۱۸	طلسمی فانیس

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۸ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت فی جلد ۱۰

نگارستان

زیر طبع ہے

شاعر کا انجام

نیاز فتحپوری کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ جو زور انشا اور حسن بیان کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز ہے
قیمت مع محصول ۱۲

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تحلیل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شاعر نہیں ہوا۔
قیمت فی جلد ۸

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوح اور کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھنے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔
قیمت فی جلد ۱۲

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔
قیمت فی جلد ۸

علم فراست الید

یعنی بات کی لکیروں کو دیکھ کر ایک شخص کی سیرت اور اس کے مہی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ مضامین نگار میں شائع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں مرتب کیا جا رہا ہے اور آخر دسمبر ۱۹۲۱ء تک شائع ہو جائیگا۔ اس کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اس قدر آسان زبان میں حل کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے بات دیکھ کر صحیح احکام صادر کر سکتا ہے قیمت فی جلد ۸

ظریف شاعروں کا تذکرہ

تذکرہ خندہ گل

اردو و فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونہ کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب باقی موضوع اور دلچسپی کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے حجم ۵۰۰ صفحات قیمت مع محصول ۸

فلسفہ مذہب

جو سلسلہ دار نگار میں شائع ہو چکا ہے زیر طبع ہے

(”نمو“ رسالہ ”نگار“ نظر آما دیکھئے)